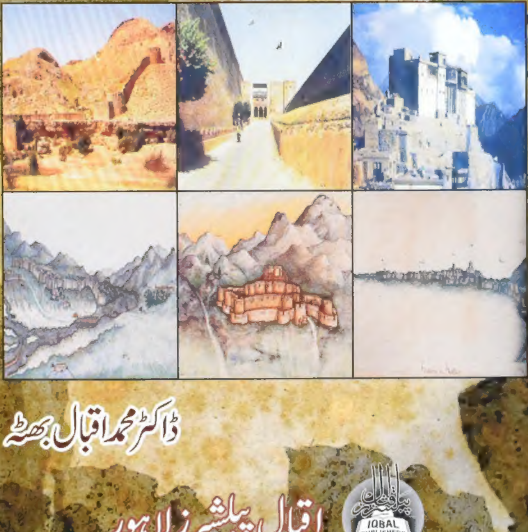
پاکستان کے
قلعہ بند شہر اور قلعے



ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ

IQBAL PUBLISHERS
اقبال پبلشرز لاہور

پاکستان کے
قلعہ بند شہر اور قلعے

ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ

اقبال پبلشرز A-112 بی۔ او۔ آر کالونی
جوہر ٹاؤن لاہور

بہ اشتراک سنگت پبلشرز

C-25 لوئر مال لاہور فون: 042-37358741

نام کتاب .... پاکستان کے قلعہ بند شہر اور قلعے

مصنف .... ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ

سرورق .... شاہد گلزار

اشاعت اوّل........................ مارچ 2011ء

تعداد .... ایک ہزار

مطبع .... عدن پرنٹرز لاہور

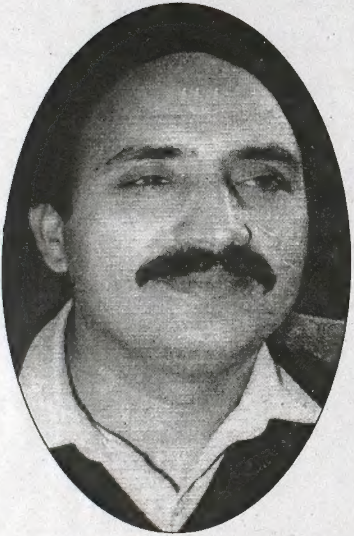
....

ناشر .... اقبال پبلشرز، 112-A بی۔او۔آر کالونی

جوہر ٹاؤن لاہور

☆ ...... ☆ ...... ☆

انتساب



پروفیسر ڈاکٹر محمد عباس نجمی کے نام

فہرست مضامین

☆☆☆

حرفِ آغاز

خطۂ پاکستان جنوبی ایشیاء کے مغرب میں واقع ہے مشرق کی طرف ہندوستان اور مغربی جانب ایران اور افغانستان اور شمال میں چین کا صوبہ سنکیانگ اور تاجکستان اس کے ہمسایہ ممالک ہیں اور جنوب میں وسیع بحیرہ عرب ہے پاکستان میں معروف سلسلہ ہائے کوہ ہمالیہ شمال مشرقی طرف اور شمال کی طرف بلند قراقرم اور کوہ ہندوکش واقع ہیں۔ اور سلسلہ کوہ سلیمان بلوچستان کے مغرب میں واقع ہیں جو نیچے کی طرف سلسلہ کوہ مکران تک جاتے ہیں باقی ماندہ زمین صحرا پر مبنی ہے صحرائے تھر اور چولستان ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ واقع ہیں اور صحرائے تھل دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے جس کے درمیان زرخیز پٹی شمال سے مغرب تک اس ملک کے وسط تک جاتی ہے جو میدانی علاقوں پر مشتمل ہے جسے پانچ دریا سیراب کرتے ہیں اسے پنجاب کہتے ہیں۔

پنجاب میں پنجابی سندھ میں سندھی اور خیبر پختونخواہ پٹھانوں اور پختونوں کی سرزمین ہے جب کہ شمالی علاقہ جات میں پاکستانیوں کی تعداد قلیل ہے جس میں کافرستان کالاش، چترال اور گلگت و ہنزہ کے علاقے شامل ہیں پنجاب کے شمال میں ہندکو ہزارہ ڈویژن تک بولی جاتی ہے جبکہ بولی جاتی ہے۔ پاکستان میں آریہ یونانی منگول ترک عرب اور یورپین اثرات یہاں کی ثقافت میں نمایاں ہیں۔ سطح مرتفع پوٹھوہار اور وادی سون پنجاب کے شمال میں واقع ہے جہاں پتھر کے زمانے کے آثار ملتے ہیں جو اندازً 20 لاکھ سال پرانے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں سطح مرتفع بلوچستان کی چار ہزار سال سے سات ہزار سال پرانی تہذیب کے آثار ملتے ہیں

جو ایران سے پاکستان کی وادیٔ سندھ کی تہذیب تک پہنچتے ہیں آریاؤں کی آمد کے بعد پاکستان میں ایک نئی ثقافت وسطی ایشیاء کے قبائل کے ملاپ سے وجود میں آئی پاکستان اور اس کے باہر آریائی تہذیب کے پھیلاؤ کے ساتھ یہ علاقہ ہندوستانی تہذیب کی مغربی چوکی ثابت ہوا مگر برھمن ازم کے مراکز مغرب سے شمالی ہندوستان منتقل ہو گئے چھٹی صدی قبل مسیح میں ملک کا شمال مغربی علاقہ (گندھارا) ایران کی اخمینی سلطنت کا حصہ بن گیا 27-326 ق م میں سکندرِ اعظم نے پاکستان پر حملہ کیا اگر چہ وہ یہاں کچھ دیر رُکا مگر اس کے ساتھ آنے والے حملہ آوروں میں یہاں افغانستان کے ہمسایہ میں باختری کالونیاں قائم کیں جس کے اثرات گندھارا میں گپتا خاندان کے بعد تک قائم رہے اسی عرصہ میں پاکستان موریہ سلطنت کا حصہ بنا جب اشوکا نے بدھ ازم قبول کیا اس وقت گندھارا کا یہ علاقہ بدھ ازم کے حوالے سے اہمیت اختیار کر گیا جن کا اپنا فنِ تعمیر اور آرٹ تھا۔ سیتھیین کی طرح پارتھین اور کشان جو وسط ایشیاء اور مغربی چین سے جنوب کی طرف باختریہ سے موجودہ پاکستان کی طرف بڑھے اس طرح گندھارا میں ایک نیا فن بت سازی وجود میں آیا جو یونانی وسط ایشیائی اور پاکستانی ثقافت کا نمائندہ تھا ساتویں صدی عیسوی میں ہندومت کے فروغ کی وجہ سے بدھ مت کو زوال شروع ہو گیا۔ اور پاکستان ایک مرتبہ پھر ہندوستان کا حصہ بن گیا مسلم فاتحین کے آنے کے بعد یہاں بغداد، سمر قند، بخارا اور اصفہان کی ثقافت کے اثرات نظر آنے لگے۔ جو مغلوں کے عہد میں نمایاں ہوئے مغل وسط ایشیاء سے آئے تھے۔ انہوں نے جلد ہی اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔

سترہویں صدی میں ہندوستانی دولت نے مغربی یورپ کے تاجروں کو اپنی طرف کھینچا اور تجارت کی آڑ میں انگریز سیاسی طور پر اُبھرنے لگے اور انیسویں صدی کے وسط میں انڈیا برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا انگریز کی سو سالہ حکومت نے اس خطہ پر اپنے اثرات چھوڑے۔

تحریکِ آزادی کے مطالبہ کے پیشِ نظر 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا جو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان پر مشتمل تھا۔ مغربی پاکستان رقبے کے لحاظ سے جب کہ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے بڑا تھا۔ پاکستان کے دو بازو تھے 1970ء میں ہندوستان کی مدد سے اندرونی بغاوت کی وجہ سے مشرقی بازو بنگلہ دیش بن کر اُبھرا موجودہ پاکستان پانچ صوبوں پر مشتمل ہے جن میں سندھ، بلوچستان، پنجاب، خیبر پختونخواہ اور گلگت بلتستان ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں پانچوں صوبوں کے قلعوں کی تاریخ دی گئی ہے۔

پنجاب کے آثار قدیمہ اور سندھ کے آثار قدیمہ اور لاہور اور فن خطاطی کے بعد اب میری چوتھی کاوش پاکستان کے قلعہ بند شہر اور قلعے آپ کے ہاتھ میں ہے جس میں کم و بیش 79 قلعے اور قلعہ بند شہروں کے بارے معلومات فراہم کی جارہی ہیں اس قلعوں میں سندھ، بلوچستان، پنجاب، گلگت بلتستان اور خیبر پختونخواہ کے قلعوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسکی ترتیب میں تاریخی تواتر کے بغیر ہی یہ تفصیل مہیا کی گئی ہے جن میں 31 سندھ میں، 34 پنجاب میں اور 5 خیبر پختونخواہ اور 5 بلوچستان کے اور 4 شمالی علاقہ جات کے قلعے شامل ہیں۔ اسکے علاوہ پنجاب کا فن تعمیر اور فوجی فن تعمیر، ریاست بہاولپور کے قلعے اور اُن کی تفصیل شامل ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں ان تمام قلعوں کی تاریخ کماحقہ دینا ممکن نہیں تھا مگر پھر بھی خاطر خواہ تفصیل دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں اپنے رفقاء کار اور استاد مکرم جناب ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، جناب سلیم الحق ڈائریکٹر آثار قدیمہ شاہی قلعہ لاہور، جناب اطہر طاہر صاحب جناب صدیق شیخ صاحب، جناب ڈاکٹر شوکت محمود، جناب رفیق ڈوگر، جناب اویس اعظم چوہدری، جناب ملک امانت لائبریرین محکمہ آثار قدیمہ، جناب محمد اسحاق سیکشن آفیسر، جناب دیگر ڈاکٹر سری و استوا پٹیالہ، جناب احمد شہباز، جناب محمود حسن رومی، جناب حاجی محمد اشرف میسر زالتصویر، جناب محمد اسحاق بھٹی، چودھری گلزار محمد

ایڈووکیٹ، جناب محمد نعیم، جناب محمد عمر، انوارالحق، جناب کرامت علی خان ایڈووکیٹ، جناب ڈاکٹر محمد عباس نجمی مرحوم، جناب عاصم چودھری، جناب زاہد چودھری ایڈووکیٹ، جناب محبوب الحسن بھلہ ایڈووکیٹ جناب حافظ محمود اختر صاحب ڈین پنجاب یونیورسٹی جناب فرزند مسیح چیئر مین شعبہ آرکیالوجی پنجاب یونیورسٹی، جناب عرفان صاحب لاہور کالج یونیورسٹی اور عصمت اللہ زاہد چیئر مین شعبہ پنجابی اور مس ثوبیہ اسلم لیکچرار شعبہ پنجابی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، جناب عبدالحسیب اور خاص طور پر اپنے بچوں محمد بلال اقبال، مصطفیٰ کمال اور حرا اقبال اور اپنی والدہ محترمہ کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اس کام کو مکمل کرنے میں بھرپور تعاون فراہم کیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ

23 مارچ 2011ء

پاکستان کے قلعہ بند شہر اور قلعے

پاکستان میں قلعوں اور قلعہ بند شہروں کی تاریخ دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک کی نسبت بہت قدیم ہے آثار قدیمہ اور ادبی شواہد اس امر کے مظہر ہیں کہ یہ تاریخ 500 ق م میں آریاؤں کی آمد سے بھی قبل کی ہے آریاؤں کے سب سے بڑے جنگجو دیوتا ''اندر'' کو ہڑپہ کے شہروں کو فتح کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آئیں اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو ''پورم دادا'' کا امتیازی خطاب جس کے معنی ''قلعہ بند'' شہروں کے غارت گر کے ہیں بہت عرصے تک تاریخ دان اور ماہرین آثار قدیمہ اس نظریہ کے حامل رہے کہ تاریخی روایات میں ملنے والے ''پوروں اور ''درگوں'' کے حوالوں اور ''اندر'' کے مذکورہ خطاب[1] کا وادئ سندھ کی قبل آریائی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ بعد کے کسی ایسے مدرسے سے متعلق ہیں جبکہ حقیقتاً ویدوں کی تدوین کی گئی تھی تاہم پاکستان کے ماہرین آثار قدیمہ کی مستند تحقیقات نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ آریاؤں کے خدشات اور ناکامیاں ٹھوس حقائق پر مبنی تھیں کیونکہ انہیں فی الواقع وادی سندھ کی تہذیب میں بسنے والے لوگوں کو فتح کرنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا[2]۔ کیونکہ وہ بلند و بالا قلعوں اور فصیل بند شہروں اور قصبوں کے باسی تھے لیکن ہم ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے باسیوں کو قلعوں اور قلعہ بند شہروں کے نظریہ کا موجد بھی قرار نہیں دے سکتے۔

قلعہ سازی اور فصیل بندی کا نظریہ ہڑپہ کی تہذیب کے دور سے تقریباً پانچ چھ سو سال قبل اپنی ٹھوس شکل میں ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ پاکستان میں ہڑپہ دور سے پہلے کا کم از کم

ایک قلعہ بند شہرکوٹ ڈیجی دریافت کیا جا چکا ہے۔ خیر پور میر سے جنوب میں تقریباً24 کلومیٹر کے فاصلے پر یہ شہر کوٹ ڈیجی کے مقام پر واقع ہے۔ یہاں قومی شاہراہ کے بالکل برابر میں اٹھارہویں صدی میں تعمیر شدہ بلند قامت ڈیجی فورٹ کے سائے میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ موجود ہے، جس کی قدامت تقریباً 3100 ق م سے 2500 ق م تک کی ہے۔[3] 1957-58ء میں ہونے والی کھدائی نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کردی ہے کہ کوٹ ڈیجی کا یہ چھوٹا سا شہراس قدیم دور میں بھی دوحصوں یعنی بالائی قلعے اور زیریں شہر میں منقسم تھا۔ اول الذکر کی پیمائش 500x350 فٹ اور بلندی تقریبا40 فٹ تھی۔ اس حصے کے اردگرد ایک خاصی بلند اور چوڑی دفاعی فصیل موجود تھی۔ یہ فصیل زمین کے اندر چٹانوں کی سطح پر استوار کی گئی تھی۔ اور اسے 10 فٹ کی بلندی تک ناتراشیدہ بڑے بڑے پتھروں کے بلاکوں کو گارے کی مدد سے چن کر تعمیر کیا گیا، تاہم فصیل کا بالائی حصہ کچی اینٹوں کی مدد سے بنایا گیا تھا محفوظ کی جانے والی دیوار کی بلندی ساڑھے پانچ فٹ سے 14 فٹ تک ہے۔ کھدائی میں صرف قلعے کی شمالی سمت میں برآمد ہونے والی دیوار کی لمبائی 108 فٹ ہے، تکنیکی اعتبار سے بھی یہ دفاعی دیوار اپنی طرز کے فن تعمیر میں غیر معمولی مہارت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اندرونی طرف سے یہ دیوار ساڑھے آٹھ ڈگری کے زاویے پر جھکی ہوئی ہے اور اسے شمالی مشرقی کونے میں اڑھائی فٹ چوڑے پشتے سے مستحکم کیا گیا ہیں بیرونی طرف سے دیوار کو مضبوط بنانے کے لئے گارے کی اینٹوں کی چنائی کی گئی ہے اور اسے مزید مستحکم کرنے کے لئے متعین فاصلوں کے بعد 32x30 فٹ کے برج تعمیر کئے گئے ہیں۔ برصغیر میں تعمیر ہونے والے کوٹ ڈیجی کا یہ قلعہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اسے بنانے والوں کا تعلق ایک مربوط اور منظم معاشرے سے تھا[4]۔ جب پہلے پہل کوٹ ڈیجی کی کھدائی ہوئی تو ماہرین نے اسے مقامی ثقافت کا حامل کوئی غیر اہم مقام قرار دیا، لیکن اس کے بعد چولستان اور ضلع شیخوپورہ میں ہونے والی دریافتوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں رحمان

ڈھیری اور ضلع ساہیوال میں ہڑپہ کے مقامات پر ہونے والی کھدائیوں سے یہ بات حتمی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کوٹ ڈیجی کی تہذیب بھی اتنی ہی ہمہ گیر تھی جتنی کہ ہڑپہ کی تہذیب۔ کوٹ ڈیجی کی تہذیب کی نسبت زیادہ قدیم ہے یا نہیں، یہ سوال متعلقہ علوم کے ماہرین کا موضوع ہے، اور یہاں اس پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہڑپہ کے لوگوں نے جو چیزیں کوٹ ڈیجی کے باسیوں سے حاصل کیں ان میں قلعہ بندی کا فن بھی شامل ہے۔

1922ء میں وادی سندھ کی تہذیب کی دریافت کے کئی سال بعد تک محققین میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا تھا کہ اس تہذیب کے لوگ بنیادی طور پر تجارت پیشہ تھے اور انہیں فن حرب چاہے وہ دفاعی ہو یا جارحانہ سے کوئی آگاہی نہیں تھی تاہم جلد ہی یہ نظریہ باطل قرار پایا ہڑپہ (1946ء) اور موہنجوداڑو (1950ء) میں ہونے والی نئی کھدائیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان علاقوں کے قلعے بہتر طور پر فصیل بند تھے اگر چہ اس ضمن میں معتد بہ تفصیلات موجود نہیں ہیں تاہم دستیاب شواہد سے اس امر کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بڑے شہروں کے انتظامی مراکز کی بھرپور انداز میں قلعہ بندی کی گئی تھی[5] لیکن یہ مراکز کسی بند پر تعمیر کئے جاتے تھے جن کا مقصد دفاعی تعمیرات کی بنیادوں کو نزدیکی دریاؤں کے سیلاب کی زد سے بچانا تھا اس ''بند'' پر گارے کی اینٹوں کی چالیس فٹ چوڑی دیوار تعمیر کی جاتی تھی جس کی چوڑائی بلندی کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ایسی دیواروں کی بلندی تیس سے چالیس فٹ بلند ہوتیں جن کے ساتھ مناسب فاصلوں پر مستطیل نما برج تعمیر کیے جاتے تھے موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے دریافت ہونے والے ان قلعوں میں داخلے کو محفوظ بنانے کے لئے مختلف تراکیب بروئے کار لائی گئیں۔

ان قلعوں کے اندر عمارت کی سطح کو اردگرد کی زمین سے خاصا بلند کیا گیا ہے اس مقصد کے لئے یا تو مصنوعی پلیٹ فارم تعمیر کئے گئے ہیں یا پھر کچی اینٹوں اور مٹی کی بھرتی

سے کام لیا گیا ہے ان بلند سطحوں پر عام استعمال کی بجائے انتظامی امور یا مذہبی رسومات سے متعلق عمارات تعمیر کی گئی ہیں موہنجوداڑو میں برآمد ہونے والے حمام، اناج کے گودام، ستونوں والے ہال اور وسیع و عریض عمارات اس ضمن میں بہترین مثالیں ہیں[6]۔ البتہ ہڑپہ کے ضلع میں ایسی عمارات افتاد زمانہ کا شکار ہو چکی ہیں اور اب ان کی شناخت ممکن نہیں رہی۔

1500 ق م تک قلعہ سازی کا فن بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ وادی سندھ کی تہذیب کی قلعہ بند عمارتوں میں سے ہم مغربی سندھ کے علی مراد اور کوہتراس اور بلوچستان میں مکران کے ساحل پر سوتکاکن دور کے مقامات کا ذکر کر سکتے ہیں[7]۔ ان تمام مقامات پر پتھر اور گارے یا اینٹوں کی تعمیر ہے اس طرح دفاعی فصیلوں کی موجودگی کے شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اگر چہ اس ضمن میں کوئی حتمی ثبوت میسر نہیں آیا تاہم اب یہ بات عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ وادی سندھ کی یہ غیر معمولی طور پر منظم اور متمدن تنظیم 1500 ق م کے قریب آریاؤں کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہوئی اگر چہ آریائی متمدن پس منظر کے حامل تھے اور ان کی تہذیب بھی غالباً انتہائی ادنیٰ تھی، تاہم ان کی ویدیں پنجاب کے قدیم ترین باشندوں کے ان شہروں اور مضبوط مراکز کے بارے میں اہم معلومات مہیا کرتی ہیں جنہیں آریاؤں کے ہاتھوں تباہی کا سامنا کرنا پڑا زمانہ قدیم سے شہروں کے لیے استعمال کی جانے والی اصطلاح ''پور'' یا ''پورہ'' کا مطلب ہی ''قلعہ'' یا مضبوط مرکز یا جیسا کہ بعض کا خیال ہے کہ ''قلعہ بند شہر'' ہے روایات میں دھات سے بنے ہوئے شہروں اور سو فصیلوں والے قلعوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کی مکمل تفہیم ابھی تک ممکن نہیں ہو سکی اسی طرح ان آریائی روایات میں پتھر اور گارے کی اینٹوں سے تعمیر کیے جانے والے قلعوں کا ذکر موجود ہے[8]۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پاکستان میں قلعہ بندی کی تاریخ پر

تقریباً ایک ہزار سال تک تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ملتے ہیں آریاؤں نے وادی سندھ کی تہذیب کی جگہ لی مگر انہوں نے فن تعمیر میں کوئی آثار اپنے پیچھے نہیں چھوڑے نہ صرف یہ کہ ماہرین آثار قدیمہ کسی آریائی تعمیر کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے بلکہ خود آریاؤں کا لٹریچر بھی اس ضمن میں مکمل طور پر خاموش ہے آریاؤں کے پاس گھوڑے اور بگھیاں تھیں جن کی مدد سے وہ یہاں کے قدیم باشندوں کے مویشیوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لے جاتے تھے اور ان کے قلعوں کو تباہ کر دیتے تھے لیکن کیا آریاؤں نے پاکستان کے خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں اپنے شہر قلعے اور دفاعی مراکز تعمیر کیے؟ آریاؤں کا ابتدائی لٹریچر اس سوال کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتا پاکستان میں آریائی دور کے آثار قدیمہ کی دریافت کی مساعی کا آغاز حال ہی میں ہوا لیکن اس ضمن میں کوئی قابل ذکر دریافت ابھی تک نہیں ہوئی مہابھارت اور رامائن میں جو کہ بعد کے دور کا لٹریچر ہے بڑے بڑے آریائی شہروں کا تذکرہ ملتا ہے مگر اس وقت تک آریا پنجاب کو خیرباد کہہ کر گنگا اور جمنا کی سرزمین میں آباد ہو چکے تھے اور جہاں ان کے پاس اس خطے میں اپنے قیام کے عرصہ کی تلخ یادوں کے سوا کچھ نہیں تھا جسے اب پاکستان کہا جا سکتا ہے انہوں نے اس سرزمین کو ملیچھوں، ناپاکوں اور اچھوتوں کی سرزمین قرار دیا ہمارے لئے انہوں نے جو کچھ چھوڑا وہ ہڑپہ جیسی شاندار تہذیب کے آثار کے سوا کچھ نہ تھا۔

ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک وادی سندھ کی تہذیب کا خاتمہ ایک اور طرح کے ایسے لوگوں کے گروہوں کی آمد کا نقطہ آغاز ہے جو کہ باہمی طور پر غیر مربوط اور پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی شناخت ایک خاص طرح کی ظروف سازی اور تجہیز و تکفین کی رسوم کے حوالے سے ہوتی تھی، اور انہوں نے اپنے پیچھے گندھارا کے گرستانی کلچر کا سامان، قبرستان کا سامان، بھورے رنگ کے منقش ظروف اور جھکر کلچر کے ظروف چھوڑے۔ مگر وہ لوگ اپنے لئے شہر کیسے تعمیر کرتے تھے

اوران کا دفاع کیسے کرتے تھے، تاریخ اس کا کچھ پتہ نہیں دیتی۔

بیرونی حملوں کا دور (پانچویں صدی ق م سے پانچویں صدی عیسوی تک)

چوتھی صدی ق م میں تاریخ ایک دفعہ پھر پاکستان میں شامل علاقوں پر روشنی ڈالتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ہم ایام کے منظر نامہ پر وسیع وعریض شہر، قصبوں، مضبوط قلعوں دفاعی تنصیبات اور بلند و بالا فصیلوں کی تعمیر کا عملی نظارہ کرتے ہیں سکندر اعظم کے ہمراہ آنے والے یونانی مورخین نے پاکستان کے تمام صوبوں میں ایسے مقامات کا ذکر کیا ہے ان تذکروں میں ہمیں ملوئی کے قلعہ بند دارالحکومت کا دلچسپ بیان ملتا ہے جس کی بلند فصیلوں کو سر کرنے کی کوشش میں سکندر کو مہلک زخم آئے اس دارالحکومت کو عام طور پر ملتان سے منسوب کیا گیا ہے انہی تذکروں میں ''مساگا'' کے قلعہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے اس قلعے کی نشاندہی چکدرہ کے قریب چرچل پوائنٹ فورٹ کے حوالے سے کی جاتی ہے اس قلعے کی تعمیر اور فصیل بندی میں کہیں پتھر اور کہیں لکڑی کا استعمال کیا گیا تھا اس کی دیواروں میناروں، برجوں، پشتوں اور دیگر ذرائع سے غیر معمولی طور پر ناقابل شکست بنا دیا گیا تھا چنانچہ سکندر کو اس قلعے میں داخل ہونے کے لئے پلوں اور بُرجوں کی تعمیر کے علاوہ مکر کی چالوں سے بھی کام لینا پڑا۔

بازیرہ (سوات کا جدید مقام باری کوٹ یا بریکوٹ) کا قلعہ ایک بلند چوٹی پر قائم تھا اور اس کی فصیل بندی ہر اعتبار سے مکمل تھی اسی طرح سکندر اعظم نے موجودہ منگورہ کے قریب اودیؑ گرام کے قلعے کے گرد پشتہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا قلعہ اس وقت بازیرہ کہلاتا تھا سکندر نے جزیرہ کے شہروں کو فتح کرنے کے لئے اپنی فوج کو بعض مقامات پر قلعہ بندیاں تیار کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔

پنجاب میں ایک جھیل پر واقعہ سانگلہ کا قدیم شہر ماضی میں ایک مکمل طور پر قلعہ بند شہر تھا جس کی فصیل کے کئی دروازے تھے یہاں کے لوگ بھی دیگر جنگجو قبائل کی طرح

فن میں خاصے مشہور تھے سانگلہ شہر کی فصیل اتنی طویل تھی کہ سکندر کی فوجیں اسے مکمل طور پر اپنے گھیرے میں نہ لے سکیں سکندر اعظم کے مؤرخین نے پنجاب میں بہت سی مستحکم آبادیوں کا ذکر کیا ہے ایسے ہی ایک مقام کو برہمنوں کے شہر سے یاد کیا گیا ہے۔ کننگھم نے اس کی نشاندہی تلنبہ سے شمال مغرب میں 32 کلومیٹر کے مقام پر واقع اٹاری کے قلعے کے حوالے سے کی ہے سندھ میں اس دور کے قلعوں، حصاروں اور قلعہ بند شہروں کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں سندھ کا سب سے بڑا شہر جہاں تک سکندر کی رسائی ہوئی؟ سندھی مان تھا جسے عام طور پر سیہون کا پرانا نام قرار دیا جاتا ہے[9]۔ یہ شہر یقیناً فصیل بند تھا کیونکہ تواریخ میں درج ہے کہ سکندر کی آمد پر شہر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے تاہم یونانیوں نے بعض دوسرے مقامات پر اپنی چھاؤنیاں قائم کیں اور ملک موسکانی کے مختلف مقامات کی قلعہ بندی کی جو سندھ کے ڈیلٹا سے بہت دور نہ تھے سکندر کے مورخین کی جانب سے چوتھی صدی قبل مسیح میں فصیل دار شہروں اور قلعوں کا تذکرہ اس امر کا شاہد ہے۔

چوتھی صدی قبل از مسیح میں سکندر اعظم کے عہد کے مورخین کے مطابق کوٹ ڈیجی اور ہڑپہ کے لوگوں کے بنائے ہوئے قلعے، قلعہ بند شہر اور محلات جو تین سے دو ہزار برس قبل از مسیح میں بنائے گئے تھے ان کا رجحان ختم ہی نہیں ہو گیا تھا باوجودیکہ اس دوران آریہ بھی آئے جو کہیں کر نہیں بیٹھ سکتے تھے جونہی وہ گنگا اور وادیٔ جمنا میں داخل ہوئے تو گندھارا، پنجاب اور سندھ کے لوگوں نے اپنی روایات کو دہراتے ہوئے بڑے شہر تعمیر کرنے شروع کر دیئے جو دفاعی اعتبار سے قلعہ بند تھے بدقسمتی سے ہمعصر فن حرب بالخصوص دفاعی نظام کی کئی ایک تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

سکندر اعظم کی بود و باش نے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھ دی تھی اور وہ نیا عہد آئندہ ایک ہزار برس تک بیرونی حملہ آوروں کا عہد کہلایا مقدونی حملہ آوروں کے بعد باختری یونانی، شاکا، پہلوی یا پارتھی، کشن اور ہن جیسی غیر ملکی نسلوں نے حکومت کی تھی

مقامی لوگوں نے مقدونی اور یونانی لوگوں سے کئی ایک سبق سیکھے جن میں فن حرب اور اس کا جدید دفاعی نظام بھی تھا اپنے شہروں کو بہترین دفاع فراہم کرنے کے لئے یونانی انداز کے شہری نظام پر خصوصی توجہ دی گئی انہوں نے دریاؤں اور پہاڑوں کو نہایت دانشمندی سے نئے شہروں کے دفاعی نظام کے اہم کردار کی صورت میں متعارف کروایا نہ صرف اپنے نئے شہروں کی دیواروں کو پتھر اور گارے سے قلعہ بند کیا گیا تھا بلکہ قصبوں کے بالعموم چٹانی حصوں کو بھی چھوٹے سے قلعے کی شکل دی گئی تھی نئے قصبوں کی ایک سمت کی چٹانی دیوار کو ہمیشہ چھوٹے سے قلعے کے طور پر استعمال کیا جاتا جبکہ ایک اندرونی دیوار اس کو زیریں شہر سے جدا کرتی تھی پورا شہر اونچی موٹی گارے اور اینٹوں یا پتھر کی دیواروں سے قلعہ بند کیا جاتا تھا جس میں متوازن وقفے سے مربع نما برجیاں بنائی جاتی تھیں مزید حفاظتی پیش بندی کے طور پر شہر کے پہاڑ کے پیچھے ایسے مقام پر تعمیر کیا جاتا کہ اس کے باقی اطراف میں پانی یا دریا ہوتا کہ اس طرح سے اضافی دفاع اور تحفظ ہو سکے یونانی انداز کے شہری اور دفاعی نظام کی بہترین مثال افغانستان میں واقع الخانم کا شہر ہے اور ٹیکسلا کے قریب 'سرکاپ' ہے [10] یونانی شہر بالعموم مستطیل شباہت کے ہوا کرتے تھے تاہم ملنڈا پنہا یعنی میندر کے آثار کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ یونانی شہر ساگلہ جس کو یوتھی میڈیا بھی کہا جاتا تھا (دوسری صدی قبل از مسیح) گول شکل میں تعمیر کیا گیا تھا جس کے وسط میں بادشاہ کی رہائش گاہ تھی تاہم یونانی شہروں میں ایک دو یا تین دروازے بنائے جاتے تھے صدر دروازہ بالعموم صدر شہر کی دیوار میں خفیہ طور پر بنایا جاتا تھا کہ دشمن براہ راست شہر کی صدر شاہراہ تک نہ پہنچ سکے۔

شاکاؤں اور پہلویوں نے یونانیوں کے متعارف شدہ نظام کو ایک سو برس عیسوی تک اپنایا تھا اس عہد کے قلعے کی ایک مثال ٹیکسلا کے قریب خرم پراچہ کے گاؤں کی خوبصورت وادی میں قلعہ گڑھی کی ہے قلعہ گڑھی ایک پہاڑ کی چوٹی پر بے ربط شکل میں لگ بھگ 1350 فٹ شرقاً غرباً اور 800 فٹ شمالاً جنوباً بنا ہوا ہے [11] اس کی دیوار دس

سے گیارہ فٹ موٹی پتھر کی بنی ہوئی ہے اس کی بیرونی سمت میں ایک مخصوص وقفے سے گول قلعے کی برجیاں بھی ہیں اگر چہ کھدائی کے ماہرین نے اس قلعے کی تعمیر کو پانچویں صدی عیسوی کی تعمیر کہا ہے ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار میں نے کسی جگہ اس طرزِ تعمیر کو دوسری صدی ق م یا اس سے بھی پہلے کا ثابت کیا ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قلعہ گیارہویں صدی عیسوی میں بھی زیرِ استعمال تھا جب سلطان محمود غزنوی کا بیٹا سلطان مسعود قید کر کے بالآخر قتل کر دیا گیا تھا۔

کُشان اگر چہ یونانی انداز اور اطوار سے بہت زیادہ متاثر تھے مگر شہری اور دفاعی نظام میں اپنے ساتھ نئے رجحانات لائے تھے وہ اپنے قلعہ بند شہر سطح زمین پر اس طرح تعمیر کرتے تھے کہ ان کے آس پاس نہ کوئی دریا اور نہ کوئی پہاڑ ہوتا تھا قلعہ بندی کا فنِ تعمیر یونانی انداز سے بہتر ہونے کی عکاسی کرتا تھا کشن عہد کے ایک قلعہ بند شہر سر سکھ جو ٹیکسلا کی وادی میں تھا[12] جس کی ابھی کچھ حصے کی کھدائی ہوئی ہے اس کی مثال دی جا سکتی ہے شہر مستطیل شکل میں ہے لیکن ٹھوس چوکور برجیوں کے علاوہ گول کھوکھلی برجیاں بھی بنائی گئی تھیں جن میں اندرونی راستوں سے پہنچا جاتا تھا شہر کی دیوار کا نچلا حصہ اٹھارہ فٹ موٹا اور تین میل لمبا ہے جو نیم دائرے کی شکل میں بنا ہوا ہے اور پھر دیوار دو گول برجیوں کے درمیان عموداً اٹھی ہے جبکہ دونوں برجیوں کا درمیانی فاصلہ نوے فٹ ہے عمودی دیوار اور گول برجیوں ہر دو میں تیر برسانے کی جگہیں بھی بنائی گئی تھیں۔

جہاں تک دفاعی تعمیرات کا تعلق ہے تو کُشان عہد کے انتہائی دور میں نئے رجحانات کو فروغ حاصل ہوا تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں تمام شمالی پنجاب اور گندھارا میں بدھ مت مقبول عام تھا بدھ طرزِ تعمیر کو واضح طور پر فروغ حاصل ہوا غیر ملکی حملہ آوروں کے باعث بدھ راہبوں نے آرام گاہوں کو ان کی اونچی سادہ دیواروں اور محض ایک راستے کی وجہ سے مستقلاً چھوٹے سے قلعے کی شکل میں بدل دیا تھا ٹیکسلا کی وادی میں جولیاں، موہڑہ مراد، دھرم راجیکا وغیرہ کے مقامات پر بہترین قلعہ بند خانقاہیں

دیکھی جاسکتی ہیں دھرم راجیکا اور بھمالہ میں بھی انہوں نے اونچے ڈھیر بنا رکھے تھے[13] جو نگران چوکی کا کام دیتے تھے تاکہ یہاں سے انہیں اطلاع ہو جائے اور یہاں کے مکین پہاڑوں میں تحفظ لیں یا پھر گڑھی جیسے بعض قلعوں میں بھاگ کر پناہ لے لیں۔

اس عہد میں مخصوص تاریخوں کو بعض قلعے اور قلعہ بند شہر اور بلند مینار تعمیر کیے گئے تھے چھوٹے قلعے جو بڑے شہروں کے ساتھ تعمیر کیے گئے ان میں قدیم پشکلاوتی یعنی چارسدہ کے قریب بالا حصار کا نام لیا جاسکتا ہے اسی طرح پشاور یعنی قدیم پرش پورا کا بالا حصار (بلند قلعہ) ضلع جھنگ میں موجودہ شورکوٹ یا قدیم سبی پورہ اور ملتان کے چھوٹے قلعے شامل ہیں قلعہ بند شہروں میں قدیم وسطی پنجاب کے دارالحکومت میاں علی فقیراں یعنی تاکی یا اسرور، قلعہ سیالکوٹ یا قدیمی ساگلہ جو قدیم میندر کا دارالخلافہ تھا اس عہد کے بے شمار قلعہ بند شہر اور چھوٹے قلعے گنوائے جاسکتے ہیں[14]۔

پانچویں صدی اور اس کے بعد آریہ اور ہنوں نے اپنے پیش روؤں کے تعمیر کردہ قلعے زیادہ تر تباہ کر دیئے تھے اگر چہ انہوں نے ایک وسیع علاقے پر تادیر حکومت کی تھی مگر کوئی شہر یا قلعہ ان کے نام سے موسوم نہیں ہے سلطنت ہن میں سے ایک اور بڑی بادشاہت ہندوشاہی نے جنم لیا جس نے سب سے پہلے افغانستان میں واقع کابل کو دارالحکومت بنایا اس کے بعد دریائے سندھ کے کنارے اٹک کے بالائی حصے میں اودھے بندا پورا موجودہ ہند کو دارالخلافہ بنایا اور پھر حتمی طور پر نندنہ کو دارالسلطنت بنایا جہاں پر 1021ء میں محمود غزنوی کی افواج نے اس سلطنت کو مٹا دیا یہ نندنہ کا قلعہ ہی تھا جہاں البیرونی نے اہم تجربات کا کام کیا تھا[15]۔

ہندوشاہی کو تاریخ میں محفوظ کرنے کا کام نہیں ہوا مگر ایک چیز یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے دریاؤں اور پہاڑی سلسلوں کے ساتھ ساتھ قلعوں کی کڑیاں بنا رکھی تھیں تاکہ شمال مغرب میں ابھرتی ہوئی مسلم طاقتوں پر نظر رکھی جاسکے دریائے سوات پر ڈاکٹر اے ایچ دانی کا دریافت شدہ چکدرہ قلعہ، دریائے سندھ پر اٹک کے قریب

قلعہ ہند، قلعہ نندنہ، قلعہ کوشک اور ملوٹ کا ناقابل تسخیر قلعہ سب نمکیاتی حدود علاقہ میں دریائے قرم اور سندھ کے مقام اتصال چشمہ (میانوالی) کے قریب شمالی کافرکوٹ اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں بلوٹ شریف کے مقام پر جنوبی کافرکوٹ کا قلعہ محمود غزنوی کے حملے سے ذرا قبل کی مثالی فوجی تعمیرات ہیں ان میں قلعہ ملوٹ سب سے زیادہ ناقابل تسخیر تھا اس کی کل لمبائی چوڑائی 2000x1500 فٹ تھی جبکہ جو حصہ قلعے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس کی کل پیائش 1200x500 فٹ تھی یہ کیتاس پرانے سنگھ پورہ کے مغرب میں تقریباً نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

پاکستان میں واقع ان مثالی قدیم قلعوں کی فوجی طرز تعمیر کی تاریخ کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اگر چہ ان قلعوں کو شرقی اور غربی گروپوں میں مزید تقسیم کیا جا سکتا ہے[16] جیسا کہ وہیلر نے اپنی کتاب ''پاکستان کے پانچ ہزار برس'' میں لکھا ہے لیکن اس وقت ہم کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے جگہ کی کمی کے باعث ہم یہاں اس دور کے قلعوں کی تعمیرات پر زیادہ بحث نہیں کر سکتے ہیں تاہم اس کے باوجود ان میں سے دریائے سندھ کے کنارے ایک قلعے شمالی کافرکوٹ کے بارے میں ہم تفصیل میں جائیں گے۔

یہ قلعہ جو شمالی کافرکوٹ کا قلعہ کہلاتا ہے لگ بھگ پچاس ایکڑ دشوار گذار علاقے پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں قریب قریب گول اور مستطیل برجیاں ہیں جبکہ زمینی سمت کی جانب سے محرابی داخلی راستہ ہے ان میں سے ایک برجی کی اونچائی چالیس فٹ تک ہے ''اس کے مغربی کنارے کی جانب دفاع کے برعکس بیضوی شکل کا تقریباً 140 فٹ لمبا ایک چھوٹا سا قلعہ نما ہے جس کی دیواریں عام سطح سے بلندی پر سے اٹھائی گئی ہیں تاکہ بہتر صورت میں دفاعی حکمت عملی اختیار کی جا سکے۔[17]'' (وہیلر)

اس سے ہمیں پتہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کا دور 712ء میں محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہوتا ہے مسلمانوں کی ابتدائی قلعہ بندیوں کا آغاز بھی انہیں تاریخوں سے ہوا تھا، دیبل کا ساحلی قصبہ جسے آج بھنبھور کہا جاتا ہے کراچی کے قریب موجودہ جگہ پر

دیبل آٹھ سو برس تک قائم رہا جبکہ اس کو 712ء میں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا لیکن آٹھویں صدی میں اس کو مسلمانوں نے پہلی بار قلعہ بند کیا تھا کھدائی کے دوران اس چھوٹے سے قلعے کا ایک حصہ دریافت ہوا ہے جو اس بات کی علامت کے طور پر سامنے آیا ہے نئی مسلم قوت کس قدر مضبوط اور ٹھوس تھی قلعہ بندی کی دیوار نے جنوب میں بنے ہوئے مستطیل نما قلعے کی پہاڑی کو جو گھارو کریک کی جانب نصف دائرے میں تھی، کو کمر بند کی طرح جکڑ کر محفوظ کیا ہوا تھا یہ چار ادوار کی تعمیر اور تعمیر نو کی نمائندگی کرتا ہے جو آٹھویں سے تیرہویں صدی عیسوی کا احاطہ کرتا ہے اور یہ عہد بنو امیہ (711 تا 750 عیسوی) سے لے کر بنو عباسیہ (750 تا 12 ویں صدی عیسوی) کے عہد تک ہے تیرہویں صدی عیسوی میں قلیل سی نمائندگی ہوئی کیونکہ اس چھوٹے سے قلعے کی شرقی دیوار جو خستہ حال اور کمزور بھی نمائندگی کر رہی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہ عظیم الشان ساحلی شہر ایک چھوٹی سی فوجی چوکی میں تبدیل ہو کر رہ گیا[18]۔

قلعے کی دیوار کی کل بلندی انیس فٹ ہے مسلمانوں کے ابتدائی دور کی قلعہ بندی کی یہ دیوار بنیادی طور پر چونے کے پتھروں اور بجھے ہوئے چونے کو مٹی میں گوندھ کر بنائی گئی تھی اس کو مزید مضبوطی فراہم کرنے کے لیے باضابطہ وقفوں کے ساتھ بڑی بڑی نیم گولائی والی برجیاں بنائی گئی تھیں اس کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے اس کی بنیاد میں پتھر کی روڑی بھری گئی تھی قلعے کی کئی بار مرمت اور تعمیر نو کی گئی تھی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کا رقبہ کم ہوتا گیا اور یوں تیرہویں صدی عیسویں میں قلعے کے وسط میں شمالاً جنوباً ایک دیوار بنانے سے اس کا حجم نصف ہو گیا تھا شاید تیرہویں صدی میں دیبل ایک چھوٹی سی فوجی چوکی بن گیا تھا تقریباً نویں صدی کے خاتمہ کے قریب قلعہ بندی کی تعمیر نو پہلے سے کم تر پیمانے پر کی گئی تھی اس لئے اس کی گنجائش اور مضبوطی میں بھی کمی آ گئی تھی قلعے کی دیوار میں کئی ایک نئی گلیاں بنانے سے قلعے کا تحفظ خطرے میں پڑ گیا تھا۔

اس کے صرف تین دروازے تھے جن میں سے دو دروازے قلعے کو شہر کے علاوہ

قریبی جھیل سے ملاتے تھے جب کہ تیسرا دروازہ جنوب کی جانب راستے کے لئے کھلتا ہے جنوبی دروازے کی کشادگی دس فٹ تھی اور اس کے سرے پر دو نیم دائرہ نما برجیاں تھیں جن کی پشت پر ایک متاثر کن داخلی ہال تھا۔ جوروہڑی سے ملنے والے مقامی زرد پتھروں کی تعمیر ہے۔

شہر المنصورہ

سندھ کے ضلع سانگھڑ میں واقع منصورہ خالصتاً اسلامی آبادی کا شہر سفید زمین پر دریافت ہوا اور یہ اپنی تمام تر علامتوں سے ابتدائی اسلامی شہر معلوم ہوتا تھا اس شہر کو 728 تا 737 عیسوی میں دریائے سندھ کی پرانی گزرگاہ پر عرب گورنر عمر بن قاسم ثقفی نے آباد کیا تھا المنصورہ کا شہر آغاز میں ایک جدید آبادی تھا لیکن جلد ہی اس کو میٹروپولیٹن شہر بنا دیا گیا[19]۔ ہباری امارت کے تحت تعلیم کا گہوارہ اور عالمی منڈی تھا لیکن ایک بڑے شہر کی حیثیت سے یہ ڈیڑھ سو برس تک باقی رہا اور اس کے بعد تنزلی کا شکار ہو گیا بارہویں صدی یا تیرہویں صدی کے اوائل تک یہ ایک چھوٹے سے شہر کی حیثیت میں باقی رہا تھا بیلس رچرڈسن اور کرنز کی ابتدائی تحقیقات کے باوجود صحیح معنوں میں اس کی کھدائی ڈاکٹر ایف اے خان نے 1966ء میں کی تھی[20]۔ اور اب تک اس شہر پر جو کبھی جنوبی ایشیاء کا ایک عظیم اسلامی شہر تھا چودہ مرتبہ تحقیق کا کام کیا جا چکا ہے تا کہ اسلامی ثقافت پورے طور پر کھل سکے المنصورہ میں بہت سی مذہبی اور عالی شان غیر مذہبی عمارات خوبصورتی سے اینٹوں کی قلعہ بندی سے تعمیر کی گئی تھیں[21] شہر کے اردگرد چار مربع میل میں غیر مذہبی عمارات تھیں قلعہ بندی کے لئے دیوار نو فٹ چوڑی تھی اور اس کو مزید مضبوط کرنے کے لئے ہر سو فٹ کے بعد نیم دائرے کی شکل میں برجیاں بنائی گئی تھیں دیوار کی آج بھی بلندی گیارہ فٹ ہے شہر کی فصیل میں چار دروازے تھے جن میں دو ہی باقی بچے تھے ان پر اینٹوں سے کام کیا گیا تھا جبکہ نیم گولائی دار برجیاں

بنائی گئی تھیں جنہیں محرابوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

عربوں کی بادشاہت کبھی ملتان سے آگے نہیں بڑھی تھی تاہم عربوں کی فتوحات کو محمود غزنوی نے گیارہویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں آگے بڑھایا اور یوں مسلمان بادشاہت کی بنیاد رکھ دی جس نے برصغیر پر آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی اس طویل اسلامی حکومت کے باعث اور جس میں مختلف مسلمان شخصیات بادشاہ ہوئیں یہاں پر زندگی کے ہر شعبہ کے ہر شخص پر اسلامی روایات، نظریات اور رسوم کا خاصہ اثر ہوا فن اور تعمیرات دونوں پر اندرونی اور بیرونی طور پر وسیع اثرات ہوئے مسلمانوں نے تعمیرات کی اقسام اور تکنیک میں بہت سی تبدیلیاں متعارف کروائیں نئی تکنیک میں محرابیں، تہہ خانے گنبد اور موٹی دیواروں پر لکڑی کے استعمال کے بعد زیادہ وسیع و عریض عمارتیں اس میں شامل ہوگئیں اس عمل نے عمارتوں اور داخلی دروازوں کو نہ صرف بلندی ہی دی بلکہ عظمت بھی بخشی یوں دریاؤں اور نہروں پر جا بجا پل بنا کر سفر اور سواری کو آسان اور تیز رفتار بنایا مسلمانوں نے فن تعمیر کی نئی اقسام میں مساجد میناروں مقابر عالی شان شہر کے دروازوں، دیواری باغات، کارواں سراؤں، باؤلیاں، گنبددار عمارات وغیرہ کو متعارف کروایا اندرونی خوبصورتی کے لئے مسلمانوں نے روغنی ٹائلوں موزائیک، گیلے پلستر پر فن تصویر کشی پچی کاری، آئینہ کاری پتھروں پر پھول اور اشکال اقلیدس لکڑی پر نقش و نگار مصنوعی اینٹوں کے کام، غالب کاری وغیرہ کی نئی اقسام اور تکنیک کو بھی متعارف کروایا جوں جوں مسلمانوں کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوا انہیں اہم روٹوں اور مقامات پر نئے شہر قلعے اور قلعہ بند شہر بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی گئی انہوں نے مختلف قلعوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنی مرضی کے مطابق اور دفاعی ضروریات کے تحت از سر نو ڈھالا اور اس کی اندرونی اور بیرونی دیواروں کی سطح کو اپنے رجحان کے مطابق بنا دیا تاہم انہوں نے جہاں جہاں قلعے بنائے وہاں وہاں زمینی ساخت کے مطابق تعمیراتی سامان میں بھی تبدیلیاں کیں مثلاً نندنہ میں پتھر کا قلعہ لاہور

میں اینٹوں کا قلعہ اور چولستان میں کچی اینٹوں کا قلعہ بنایا انہوں نے حملہ آور ہونے اور دفاع کے لئے قلعہ بندی میں نئی تکنیک اختیار کی جو نئی جنگی حکمت عملی کے مطابق ہوتی تھی اس ضمن میں موسمی اثرات اور دشوار گذار علاقوں کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔

قلعے، فوجی چھاؤنیاں، قلعہ بند گھر اور حتیٰ کہ قلعہ بند شہر جن پر محرابی شہر دروازے، روزن فصیل، شگاف بندوقچی اور بیرکیں یہاں تک کہ خندقیں بھی بنیادی طور پر مسلم ماخذ کے مطابق تھیں کرنل کے اے رشید کے مطابق یورپ یا برصغیر میں اسلام سے پہلے کی تاریخ میں اس قسم کے خدوخال نہیں تھے مسلمانوں نے ہی یہاں پر حصار یعنی قلعہ بند شہر اور قلعے کا فرق متعارف کروایا [22] پشاور میں بالا حصار شہر کا چھوٹا سا قلعہ بند تھا لیکن روہتاس اور اٹک پر جو قلعے تھے وہ صرف اور صرف فوجی مقاصد کے لئے تھے۔ بھنبھور اور منصورہ میں بھی حصار تعمیر کئے گئے تھے جو قلعے نہ تھے بالعموم یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اندراپور اندر کے گھڑ سوار شہروں کو تباہ کرنے والے ہوتے تھے نہ کہ قلعوں کو برباد کرنے والے تھے۔

مسلمانوں نے برصغیر کے تقریباً ہر حصے میں قلعے تعمیر کیے تھے۔ یہ اتنے زیادہ ہیں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا تاہم ہمارے پاس اس امر کا یقین کر لینے کا جواز موجود ہے کہ بھارت میں ہندوؤں کے بنائے ہوئے قلعے بھی درحقیقت مسلمانوں کے بنائے ہوئے قلعوں کی طرز تعمیر سے متاثر ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان تمام عوامل کو شمار کریں جو مسلمان قلعہ تعمیر کرنے والوں نے متعارف کروائے تھے۔

برصغیر میں مسلمان اپنی آمد سے قبل ہی شام اور مصر کی قلعہ بند چھاؤنیوں سے متاثر تھے بالخصوص یہ سچ ہے کہ روزن فصیل اور ٹیڑھے دروازے کا استعمال بھی تھا پاکستان میں جہلم کے قریب قلعہ روہتاس میں سب سے پہلی روزن فصیل کی مثال ملتی ہے [23] مسلمانوں نے ہی بڑے اور وسیع محراب دار پھاٹک متعارف کروائے تھے مسلمانوں کی آمد سے قبل قلعوں کے دروازے مستطیل اور بلندی تک کھلنے والے تھے

محراب کے استعمال نے مسلمان معماروں کو اس قابل بنایا کہ وہ قلعوں کے دروازوں کو بلند بنائیں اور جب وہ بند ہوں تو عظیم الشان محسوس ہوں انہوں نے دروازوں میں باہر کی جانب موٹی موٹی میخیں بھی پیوست کی تھیں تا کہ ہاتھیوں کی ٹکران پر نہ لگ سکے [24] موجودہ دور کے ٹینکوں کی طرح اس وقت بہترین قسم کی منجنیقیں بھی متعارف کروائی تھیں [25] جو دروازے کو توڑ سکتی تھیں اور دفاع کرنے والوں کو ہراساں رکھتی تھیں منجنیقوں کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ڈھلوان والی اونچی اور موٹی دیواریں تعمیر کی گئی تھیں اس امر نے دفاع کو مضبوط بنایا اور دشمن کی آسانی سے پہنچ سے محفوظ رکھا وقت کے ساتھ منجنیق سے پتھر کی بجائے مٹی کے تیل کے گولے چلائے جانے لگے جو آگ لگا دیتے تھے اور یہ ہندوؤں کے قلعوں اور فوجی چھاؤنیوں کے لئے زیادہ نقصان دہ تھے کیونکہ ان میں زیادہ تر لکڑی استعمال ہوتی تھی۔

مسلمان قلعہ سازوں نے ٹیڑھے دروازوں کا استعمال بھی عام کیا اور یہ تکنیک شام اور مصر سے مستعار لی گئی تھی یہ دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بنائے گئے تھے تا کہ دشمن براہ راست شہر میں داخل نہ ہو سکے پہلے پہل یہ دروازے بغداد کے گول شہر (آٹھویں صدی عیسوی) اور قاہرہ میں قلعہ صلاح الدین 1176ء میں استعمال ہوئے اور پھر اپنی بہترین شکل میں قلعہ حلب میں استعمال کیے گئے مسلمانوں نے قلعوں اور قلعہ بند گھروں کی دیواریں موڑ دار اور ان میں برجیاں جان بوجھ کر بنائی تھیں تا کہ مقابلے پر گولہ باری میں آسانی رہے اگر دشمن بارودی سرنگ کی افادیت یہی تھی کہ ایسے دشمن پر مختلف سمتوں سے گولیوں کی باڑھ ماری جائے۔

ٹیڑھے دروازے، موڑ دار دیواریں اور برجیاں کلی طور پر مسلمانوں کی کوئی نئی ایجاد نہیں تھیں بلکہ اپنے دفاعی نظام تعمیرات میں اس کے عام استعمال میں مسلمانوں کو ملکہ حاصل ہوا مسلمان اپنے ساتھ بارود بھی لائے تھے اور اس حوالے سے انہوں نے تنگ روزن تیر اندازی کو بندوقچیوں اور توپوں کے استعمال کے لئے کشادہ روزن فصل

میں تبدیل کر دیا تھا جبکہ برجیاں بھی اسی لئے بنائی گئی تھیں انہوں نے قلعہ بند دیواروں کے ساتھ فوجی بارکیں بھی بنائی تھیں جنہیں غلام گردش کہا جاتا تھا بعض اوقات ان میں جابجا راستے بنا کر فوجیوں کو تحفظ بھی فراہم کیا جاتا تھا انہوں نے قلعے کی دیواروں میں سرنگ لگانے کی تکنیک بھی ایجاد کی تھی جس کے تحت گڑھے کھود کر اس میں ریت کی بوریاں بھر دی جاتی تھیں تاکہ دیوار کی بنیاد تک رسائی ہو سکے اور دیوار توڑی جا سکے مسلمانوں نے اپنے قلعے کی دیواروں کی بنیادوں کو اس حملے سے بچانے کے لئے خاصا چوڑا بنایا تھا بعض جگہوں پر تو ان کی چوڑائی چالیس فٹ تک تھی یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بنیاد کو گہرا بھی بنایا جاتا تھا اس کے علاوہ صدر دروازے کے سامنے چوڑی اور گہری خندقیں بھی بنائی جاتی تھیں جن پر ہٹائے جانے والے پل بنائے جاتے تھے حملہ آوروں نے بہتر سیڑھیاں بھی بنائی ہوئی تھیں تاکہ فصیل پر چڑھنے میں آسانی رہے۔

برصغیر میں جابجا مسلمانوں نے قلعے اور قلعہ بند شہر تعمیر کیے تھے ان میں سے بعض قلعے تو قلعہ بند شہروں کے پیچھے بنائے گئے تھے جبکہ بہت سے سفید زمین پر ملتے ہیں پہلی قسم کے قلعوں میں ہم چولستان کے ریگزاروں میں واقع قلعہ دراوڑ کہہ سکتے ہیں جو بنیادی طور پر ہندو راجپوتوں نے بنایا تھا مگر وہ بھی مسلمانوں کے ان قلعوں کی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا جیسے مسلمانوں کے سلطانی دور میں ہوتے تھے قلعہ بند گھروں میں مینگورہ کے قریب اودے گرام، نمک کے علاقے میں قلعہ نندنہ اور قلعہ کوسک اور آزاد کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے قلعہ منگلا اور قلعہ تغلو اس قسم کی تعمیر کی قابلِ ستائش مثالیں ہیں قلعوں میں دریائے سندھ پر اٹک اسلام آباد کے قریب دریائے اسوان پر پھروالا، جہلم کے قریب دریائے کاہن پر روہتاس، سندھ کے ضلع دادو میں سن کے قریب رنی کوٹ اور بلوچستان میں قلعہ خاران ایسے قلعے ہیں جن کی بنیادی قلعہ بندی خالصتاً فوجی حکمت عملی کے تحت کی گئی ہے لاہور ملتان اور تلمبہ کے قلعے پہلے سے موجود جگہوں پر بنائے گئے تھے مغلوں نے (1526ء تا 1857ء) نئی قسم کی طرز تعمیر کی بنیاد رکھی جو قلعہ

نما محل کہلاتے تھے دہلی کا لال قلعہ، آگرہ کا قلعہ اور قلعہ فتح پور سیکری یہ تمام بھارت میں ہیں اور پاکستان میں لاہور اور شیخوپورہ کے قلعے محل زیادہ اور قلعے کم معلوم ہوتے ہیں یہ صرف رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے اور محض یہاں کے رہنے والوں کی حفاظت کی غرض سے بنائے گئے تھے قلعہ رُوات واقعتاً ایک قلعہ بند کاروان سرائے تھی دیوار بند شہروں میں لاہور، ملتان اور دیپالپور کے شہر قلعہ بند شہروں کی عمدہ مثال تھے جب کہ حیدر آباد کا کچا پکا قلعہ اور اکبر کے بہترین دور کے مظفر آباد (آزاد کشمیر) اور سندھ میں عمر کوٹ کے قلعے فوجی اور رہائشی قلعے تھے۔

ریگزاروں میں چولستان کا قلعہ دراڑو، قلعہ مروٹ، قلعہ اسلام گڑھ، قلعہ موج گڑھ، قلعہ وولر، قلعہ پھلوا، قلعہ بجنوٹ اپنی مثال آپ ہیں قلعوں کی یہ کھیپ اسلامی عہد اقتدار کے آخری ایام سے پاکستان کے وسطی حصے میں واقع ہیں جو فوجی تعمیرات کی ترقی کا علم بھی فراہم کرتے ہیں یہ دو درجن قلعے سابق ریاست بہاولپور (موجودہ ڈویژن) کے ریگزاروں میں ریت کے تین سو میل وسیع وعریض سمندر میں جنگی جہاز کی طرح کھڑے ہیں[26]۔ ان کا مخصوص جائے وقوع، ان کی قسم اور انداز اور ان میں استعمال ہونے والا عمارتی سامان اس قدر موثر ہے کہ قدرتی آفات اور علاقے کی فوجی ضروریات پوری کر سکیں ان میں سے زیادہ تر قلعے دریائے ہاکڑا کے کنارے واقع ہیں کیونکہ سترہویں صدی میں دریائے ہاکڑا دفاعی لائن کی حیثیت رکھتا تھا یہ تمام قلعے پکی اور کچی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں کیا دریائے ہاکڑا اٹھارویں صدی میں بھی چولستان میں بہتا تھا؟ کیا اس کا پانی اینٹیں بنانے اور کیا وہاں سے ایندھن اس قدر دستیاب تھا کہ یہ سب کام ہوسکتا؟ اس سلسلے میں کوئی معلومات نہیں ہیں چولستان کے قلعوں میں بجنوٹ، باڑہ، جان گڑھ، کن ڈیرہ، خیر گڑھ، خان گڑھ، مچکی، میر گڑھ، وغیرہ ایسے چھوٹے مربع نما قلعے ہیں جو فوجی چوکی کے طور پر استعمال ہوتے تھے آبادیوں کے

قریب واقع قلعہ مثلاً اسلام گڑھ، موج گڑھ اور پھلڑا یا دوسرے قلعے جو انتظامی مراکز تھے مثلاً قلعہ دراوڑ اور قلعہ مروٹ نسبتاً بڑے قلعے تھے ان میں سے چار قلعے بجنوٹ دراوڑ، مروٹ اور پھلڑا کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ یہ اسلامی عہد سے قبل تعمیر کیے گئے تھے لیکن ان کا قیام اس علاقے میں اٹھارویں صدی میں فوجی تعمیرات کے وجود کی تصدیق کرتا ہے [27]۔

برصغیر میں مسلمانوں کے عہد کے خاتمہ سے خصوصاً پاکستان میں واقع تاریخی اہمیت کی حامل فوجی تعمیرات کو بہت نقصان پہنچا تھا لاہور، گجرات، ہند، ملتان اور پشاور کے قلعہ بند شہروں کو برطانوی حکومت نے جان بوجھ کر غیر فوجی کر دیا ان پر کوئی توجہ نہ دی تھی قلعہ لاہور اور پشاور کا بالا حصار قلعہ اٹک اور مظفر آباد کے قلعوں میں فوج آباد تھی اور آج بھی ماسوائے قلعہ لاہور کے فوج ہی آباد ہے برطانوی حکومت کی فوجی حکمت عملی کے تحت اس کی دلچسپی محض انہی شہروں میں تھی جو سڑکوں کے نظام سے مربوط تھے مثلاً لاہور، ملتان اور دہلی جبکہ پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر انہوں نے نئے قلعے بنائے اور پرانے قلعوں مثلاً درہ خیبر میں قلعہ شبقدر پشاور کے قریب قلعہ جمرود، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں قلعہ وانا، کوئٹہ کے قریب قلعہ سنڈیمن کے علاوہ صوبہ جات سرحد اور بلوچستان کے دیگر کئی ایک قلعوں کو اپنے زیر استعمال رکھا۔

اب ایٹمی دور کے آ جانے سے جنگی حکمت عملی میں تبدیلی آ چکی ہے اور اب دفاعی ضروریات کے لئے قلعوں اور قلعہ بند شہروں کی ضرورت باقی نہیں رہی اس وقت آلات حرب میں بنکرز اور زیر زمین دفاعی نظام کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت متاثر کن قلعے، بلند و بالا شہر اور عالی شان چوبی دروازے محض تاریخ کا ایک باب ہیں یا پھر سیر و سیاحت کے مراکز بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہمارے ہی اجداد کے وقت میں ان کی بڑی اہمیت تھی اور اس حوالے سے پاکستان کا ایک نمایاں اور اہم مقام ہے۔

اٹک روہتاس، پھروالہ، لاہور، نندنہ، شمالی کافرکوٹ، ملوٹ، پنجاب میں ٹیکسلا کے قریب گڑھی کے قلعے اوراودے گرام (سوات) پشاور میں بالا حصار اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بلوٹ کے مقام پر جنوبی کافرکوٹ کے قلعہ نما، پھررنی کوٹ، قلعہ منگلا، قلعہ تغلو، آزاد کشمیر میں قلعہ مظفرآباد، بلوچستان کے شہر سبی کا قلعہ خاران، یہ چند ایک ایسی تاریخی مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس خطے پاکستان کے غیور عوام ہمیشہ وطن دشمنوں کے خلاف ڈٹے رہے ہیں اور بیرونی حملہ آوروں سے بجا طور پر نبرد آزما ہوتے رہے تھے اور آج بھی ہر جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

قلعہ میاں غلام شاہ کلہوڑا

حیدرآباد قلعہ کی تعمیر کے کوئی 4 سال بعد 1186ھ مطابق 1772ء میں جب میاں غلام شاہ کلہوڑا نے وفات پائی تو اسے حیدرآباد کے شمال میں گنجوٹکر کے سرے پر دفن کیا گیا۔ وصیت کے مطابق مزار کے چاروں اطراف مٹی کا قلعہ میاں غلام شاہ کے بیٹے میاں سرفراز شاہ نے بنوایا مزار کے اندر جنوبی دیوار میں محراب نما دروازے کے اوپر میاں سرفراز شاہ کے اشعار تحریر ہیں جو سندھی، فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان اشعار کے آخری مصرع سے غلام شاہ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

نہ گہ از تنزیل در دادِ ایں ندا
ہاتفی جنات مینھا خالدا

۱۱۸۶ھ

کسی نے کہا ''میاں خفتہ'' یعنی میاں نے آرام کیا اس فقرے سے بھی یہی تاریخ وفات نکلتی ہے[28]۔ میاں غلام شاہ کلہوڑا کا مقبرہ اپنے فن تعمیر کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے جو 1186ھ/1772ء میں بنایا گیا۔ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں اس کا گنبد اوپر سے گر گیا اس مقبرہ کی موجودہ حالت کے مطابق اس کی ٹائیلیں جگہ جگہ سے اکھڑی پڑی ہیں اور بڑا گنبد گر چکا ہے۔ جس کی جگہ عارضی چھت ڈالی گئی ہے پچھلے کئی سالوں سے اندرونی حالت بھی زبوں حالی کا شکار ہے جس کی وجہ سے فریسکو پینٹنگ بھی اب ناپید ہیں جنھیں ختم کرنے کی وجہ سے یہ اور بھی خستہ حالی کا شکار ہے مقبرہ کے اندر قبر کا تعویذ اچھی حالت میں ہے جب کہ خواتین والا احاطہ قبور زبوں حالی کا شکار ہے مقبرہ کے اندر سے سیڑھیاں چھت تک جاتی ہیں۔

اس مقبرہ کی کچی چار دیواری زبوں حالی کا شکار ہے جہاں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ چونے کا پلاسٹر کئی جگہوں سے اکھڑا پڑا ہے مشرقی اور مغربی جانب عوام نے قبضہ کر رکھا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ حکومت پاکستان نے مقامی پتھر کی جالیاں بنوا کر کسی حد تک اس کی بحالی کا کام کر رہا ہے۔

قلعہ حیدر آباد

میاں غلام شاہ کلہوڑا نے 1182ھ/ 1768ء میں پرانے قلعہ کی جگہ نئے قلعہ کی بنیاد رکھی تاریخ میں حیدر آباد کا نام نیرون کوٹ کے طور پر آتا ہے یوں یہ قلعہ پہلے ہی سے یہاں موجود تھا۔ قرآنی آیت سے فال نکالی گئی جو جملہ نکلا "یا رب اجعل هذا البلاد الامنا" جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو اس شہر کو امن کا گہوارا بنا قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس آیت کو سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کر کے قلعہ کے صدر دروازے کے عین اوپر لگایا گیا جس کے نیچے یہ الفاظ درج تھے

"بامر عالی مظہر ولایت میاں غلام شاہ خان عباس بن میاں نور محمد بن یار محمد بن میاں نصیر محمد عباسی بنا یافت۔"

قلعہ کا قطر ایک میل اور سطح سمندر سے بلندی 80 فٹ ہے اس کی تعمیر کا کام انجینئر استاد شفیع محمد ملتانی کی زیر نگرانی اس دور کے مشہور معماروں نے سرانجام دیا۔ مرزا احمد خراسانی کلکیا اینٹ گچ اور گارے کی دیکھ بھال اور اس کی کوالٹی بہتر بنانے پر مامور تھا۔ قلعہ بنانے والے مزدوروں کو 6 پیسے اور کاریگروں کو 10 پیسے یومیہ اجرت ملتی تھی قلعہ کے درمیان ایک بڑا شاہی محل بنایا گیا قریب ہی میاں غلام شاہ کلہوڑا کے محل کے علاوہ حرم سرائے دیوان خاص اور دیوانِ عام بھی تعمیر کیے گئے ساتھ ہی اناج گودام اور بارود خانہ بھی بنائے گئے۔

کہتے ہیں قلعہ میں میٹھے پانی کے پانچ کنویں کھودے گئے مگر کسی سے بھی میٹھا

پانی نہ نکلا قلعہ کے شمال مشرقی جانب ایک خفیہ چھوٹا دروازہ تھا جبکہ شمال میں شاہی دروازہ تھا ان دو دروازوں کے علاوہ قلعہ میں آنے جانے کا کوئی اور دوسرا راستہ نہ تھا۔ قلعہ کی دیواروں کے ساتھ مورچے بنائے گئے تھے اس کی مشرقی اور جنوبی فصیلیں بہت اونچی ہیں، جبکہ مغربی حصہ میں دو فصیلیں تھیں باہر والی فصیل گول کمانی کی طرح اور دوسری بیضوی شکل میں بنائی گئی تھی۔ اس قلعہ کے دروازے کے دونوں پٹ بڑے اور مضبوط تھے ان میں سندھ کے دوسرے قلعوں کی طرح لوہے کی موٹی موٹی میخیں لگائی گئی تھیں تاکہ دشمن ہاتھیوں کے ذریعہ اس دروازے کو توڑ نہ سکے دروازے کے باہر مغرب کی جانب ایک بڑا سا مینار بنا ہوا تھا۔ یہاں سے قلعہ کی نگرانی کی جاتی تھی، اس ٹاور کو انگریزوں نے مسمار کرا دیا آج کل وہاں پر پانی کا ٹینک ہے۔ میر مراد علی خان تالپور کے دور میں بڑے دروازے کے اندر مغربی حصہ میں ضرب خانہ تھا جہاں پر ریاست کے سکے ڈھالنے کا کام ہوتا تھا اسے بھی انگریزوں نے بند کرا دیا قلعہ کے اندر عمارتیں بے ترتیب بنی ہوئی تھیں گلیاں بھی تنگ تھیں ڈاکٹر جیمز برنس نے جو 1828ء میں علاج کی غرض سے اس قلعہ میں آیا تھا اپنی کتاب A viisit of the Court of Sindh میں لکھتا ہے کہ ''جب وہ قلعہ میں داخل ہوا تو ہر طرف سکوت تھا میں پتلی پتلی ناہموار جگہوں اور گلیوں سے گزر کر دربار میں پہنچا جو ایک عالی شان عمارت تھی''[29] منقش اینٹوں سے دیواریں سجی تھیں جب قلعہ کی تعمیر کے لئے کھدائی شروع کی گئی تو یہاں سے کئی سو برس پرانی لاشیں نکلیں جو حیرت انگیز طور پر اتنی مسخ شدہ نہیں تھیں جتنا کہ انہیں ہونا چاہیے تھا۔ قلعہ کے بارے مؤرخین کا کہنا ہے کہ سندھ میں اس سے پہلے اتنا مضبوط بڑا اور شاندار قلعہ پہلے نہیں تھا یہ صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں تعمیر ہوا۔ بعض مؤرخین کا اس مدت میں اختلاف اس وجہ سے ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قلعہ یہاں پہلے سے ہی موجود تھا جو کوٹ نیرون کے نام سے موسوم تھا اور میاں غلام شاہ کلہوڑا نے اس کی مرمت کرائی اور جہاں جہاں سے یہ منہدم ہوا تھا اسے دوبارہ تعمیر کرایا تحفۃ الکرام میں ذکر ہے کہ قلعہ کی تجویز ذی القعد 1182ھ میں پیش کی گئی اور ایک مہینے بعد

ہی اسی سال ذوالحج کے مہینہ میں قلعہ تیار ہو گیا[30]۔ اور پھر غلام شاہ کلہوڑا اس میں منتقل ہو گیا۔ یہ قرین قیاس نہیں اس بارے ڈاکٹر ممتاز پٹھان اپنے مقالے ''سندھ کے تاریخی شہر'' جونئی زندگی میں چھپا، لکھتے ہیں[31]۔ محب اللہ بکھری اپنی تاریخ کی کتاب میں کہتا ہے کہ حیدرآباد دراصل نیرون کوٹ کے نام سے مشہور تھا مغل اسے فتح کرنے کے بعد حیدرآباد کہنے لگے وجہ یہ تھی کہ اسے حیدر قلی نامی قلعہ دار نے نئے سرے سے تعمیر کرایا تھا اسی طرح شیر علی قانع ٹھٹھوی نے اپنی کتاب ''مقالات الاشعراء'' حیدرآباد کو حیدرآباد میں غلام شاہ کلہوڑا کی آمد سے کوئی آٹھ سال قبل لکھ کر پورا کیا جس میں حیدرآباد کے کئی شعراء کا ذکر ہے جن کے نام کے ساتھ نیرون کوٹی لکھا گیا ہے۔ اس سے اسی بات کو تقویت ملتی ہے کہ کلہوڑوں کی آمد سے قبل بھینیرون کوٹ قلعہ موجود تھا یہی مصنف اپنی کتاب ''تحفۃ الکرام'' میں لکھتا ہے کہ اکبری زمانہ تک حیدرآباد کا نام نیرون کوٹ ہی تھا[32]۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ مرزا جانی بیگ سندھ کا ارغون حاکم تھا اس نے انتظامی لحاظ سے سندھ کو کئی پرگنوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ 996ھ کی بات ہے اس تقسیم میں نیرون کوٹ والا علاقہ مرزا محمد تارخان اور قاسم علی سلطان ساربان کے حوالہ کیا گیا مرزا محمد تارخان سے اپنے والد مرزا محمد باقی کے ہاتھوں ایک سفارت اکبر بادشاہ کے دربار میں روانہ کی جس میں حاجی بیگم میر یادگار مسکین۔ نور اللہ ترخان وغیرہ شامل تھے۔ بیگلارنامے میں بھی صاف طور پر نیرون کوٹ کا ذکر موجود ہے جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قلعہ اس وقت بھی موجود تھا خود کچے قلعہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اسے میاں غلام شاہ کلہوڑا نے بنوایا تھا جبکہ شواہد بتاتے ہیں کہ یہ قلعہ بھی یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ شاہ محمد مکی کے روضہ پر لکھے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ 1082ھ سے بنایا گیاں مصرعہ کچھ یوں ہے

بجستم زدل سال تعمیر او
بگفتا خرد ''زیب بزم ھنوز''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قلعہ غلام شاہ کلہوڑا کے اس خطے میں آنے سے سو سال

پہلے کا ہے البتہ ایک بات مشہور ہے کہ چونکہ کچا قلعہ پکے قلعہ سے زیادہ بلند تھا تو میاں غلام شاہ کلہوڑا نے حکم دیا کہ اسے ڈھا کر چھوٹا کیا جائے بعد میں جب وہ شدید بیمار ہوا تب لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے زیرعتاب آیا اور اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس کی وجہ سے وہ تقریباً اپاہج ہوکر رہ گیا تھا یہ بات جواہر عباسیہ کے نسخے کے علاوہ اب تاریخ سندھ میں بھی درج ہے۔ قلعہ غلام شاہ کلہوڑا نے بنایا یا اس کی تزئین کرائی اس میں دو رائے ہوسکتی ہیں مگر یہ بات تو طے ہے کہ حیدرآباد شہر کو بسانے میں میاں غلام شاہ کلہوڑا کا ہی کردار رہا ہے۔ قلعہ کا رقبہ 136 ایکڑ اراضی پر محیط ہے۔ انگریزوں نے قلعہ فتح کرنے کے بعد یہاں پر چھاؤنی بنا لی اور یہاں گولہ بارود کا ذخیرہ بھی جمع کرلیا اس بارود نے 15 اپریل 1906ء بروز اتوار رات 8 اور 9 بجے کے درمیان گرمی کی وجہ سے آگ پکڑ لی اور پورا شہر آتشیں دھماکوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے بعد ایف. جی ہراٹ کلکٹر حیدرآباد نے بارودخانہ کی جگہ ریکارڈ آفس قائم کردیا۔

کلہوڑا، بادشاہوں کی آپس میں رنجشوں اور ریشہ دوانیوں نے بڑا نقصان پہنچایا بعد کے حکمران کانوں کے کچے اور بداعتماد تھے انہوں نے اپنے وفادار بلوچ سرداروں کو قتل کرواکر بداعتمادی کی فضا قائم کی ساتھ ہی ان کے دورحکومت میں نادرشاہ اور احمد شاہ نے سندھ پر حملہ کرکے لوٹ مار مچائی انہوں نے نہ صرف معاشی نقصانات پہنچائے بلکہ ان کی طاقت کو بھی کمزور کیا اس طرح کلہوڑوں کی حکومت زوال پذیر ہوئی۔

فاتح سندھ میر فتح علی خان نے 1789ء میں خداباد کو خدا حافظ کہتے ہوئے حیدرآباد کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور اس نے اپنے بھائیوں کو جمع کرکے کہا کہ خدا آباد میں ہمارے بزرگوں کا خون بہا ہے اس لئے ایسی جگہ رہنے کو میرا دل گواہی نہیں دیتا حیدرآباد کا قلعہ خوبصورت بھی ہے اور مضبوط بھی اور اس سے بڑھ کر محفوظ بھی ساتھ ہی اس علاقہ کی آب وہوا بہت اچھی ہے چنانچہ تخت گاہ کے لئے یہ جگہ انتہائی موزوں ہے

سب نے میر فتح علی خان تالپور کے مشورے کو سراہا اور فیصلہ کرلیا کہ اب نیا پایۂ تخت حیدر آباد ہوگا چنانچہ قلعہ کی مشرقی دیوار جو گر گئی تھی درست کرائی گئی پھر اپنے رشتے داروں اور مصاحبین کے لئے عمارت تیار کرائی گئیں اور قلعہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا مشرقی حصہ میں میر فتح علی خان اور میر غلام علی خان کے رہنے کے لئے عمارات بنائی گئیں اور ان کے آنے جانے کے لئے قلعہ کے شمالی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا، درمیانی حصہ میں میروں کا دربار اور باغ بنایا گیا جس کے شمال میں قلعہ کا بڑا دروازہ تھا جہاں سے ہر خاص و عام دربار تک رسائی حاصل کرسکتا تھا تیسرے اور مغربی حصہ میں بارود خانہ گودام اور فوجیوں کی رہائش گاہیں تھیں قلعہ میں مصاحبین رشتے داروں اور سرداروں کی ہائشی عمارتیں تعمیر ہو جانے کے بعد میر صاحب اپنے بھائیوں کے ہمراہ قلعہ میں داخل ہوئے اس وقت کے مشہور شاعر سید عظیم الدین عظیم ٹھٹھوی نے قلعہ کی فتح کی تاریخ اشعار میں کہی جس سے 1191ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔

پھر سید ثابت علی ثابت سہوانی نے ایک قصیدہ لکھا جس میں میر فتح علی خان تالپور اور ان کے تین بھائیوں میر کرم علی خان، میر غلام علی خان اور میر مراد علی خان تالپور کی صفات اور تعریف کے بعد حیدر آباد شہر اور قلعہ کا ذکر کیا۔

قلعہ میں جو دیگر عمارتیں بنائی گئیں ان میں میر صاحبان کے محلات مسجد میر زرب، قبلہ مسجد میر مراد علی خان، مسجد اقصیٰ جس کو شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے اب تک موجود ہیں۔ قریب ہی میروں کا دربار تھا ان کے علاوہ میر صاحبان کے ملازمین کی رہائش گاہیں ہیں اور ایک بڑی عمارت بنوائی گئی جہاں میر نصیر خان دربار لگایا کرتے تھے اس عمارت کے قوسی دروازے تھے اور دیواروں پر خوبصورت نقش و نگار اور تصاویر بنی تھیں کہیں رستم و سہراب کی تصاویر تو کہیں میروں کے دربار کا منظر کہیں حضرت سلیمانؑ کے دربار کا منظر اور دیو اور پریوں کی تصاویر دعوت نظارہ دیتی تھیں 1836ء میں اسسٹنٹ سرجن جی ایف ہڈل حیدر آباد کا قلعہ دیکھنے کے لئے آیا وہ لکھتا ہے قلعہ کے

اندر کی عمارات آگے پیچھے اور بے ترتیب بنی ہوئی ہیں تلی تلی اور ناہموار گلیاں ہیں جبکہ قلعہ کے مقابلہ میں شہر ایک ترتیب سے بنایا گیا ہے [33]۔

جی ایف ہڈل نے وہی بات لکھی ہے جو اس سے قبل جیمز برنس نے کہی تھی۔ میروں کے خاص مصاحبین کی رہائش گاہیں قلعہ کے اندر تھیں ان میں سید عظیم الدین ٹھٹھوی میاں طاہر خدمت گار جو میر غلام علی خان کا امیر اور لشکر کا سردار تھا اس نے میروں کے ساتھ مل کر کئی لڑائیاں لڑیں خاص طور پر میر صادق علی خان آف بہاولپور سے جو میروں کی لڑائی ہوئی تھی اس میں اس نے داد شجاعت دی تو میر صاحب نے اسے نواب کا خطاب دیا۔

میر فتح علی خان تالپور کے دور میں حیدر آباد تیزی سے بسنا شروع ہوا لوگ دور دراز سے یہاں آ کر بسنے لگے خاص طور پر خداباد کے ہنرمندوں نے یہاں ہجرت کی یہاں کے ہندو بھی میروں کے ہمراہ حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر عامل اور بھائی بند تھے ان لوگوں نے مشہور اور تاریخی شاہی بازار کے دونوں اطراف رہائش اختیار کی۔ عاملوں نے اپنی بستیاں چھوٹی گھٹی سے سرے گھاٹ تک بسائیں جبکہ بھائی بندوں نے جمن شاہ کے پڑ سے لے کر چھوٹی گھٹی تک رہائش اختیار کی ان کی آبادی شاہی بازار کے مغرب میں تھی مسلم محلے مشرق کی طرف زیادہ تھے جو طاہر بازار سے لے کر سرے گھاٹ تک پھیلے ہوئے تھے میر صاحب کے خاص مصاحبین نے قلعہ کے آس پاس اپنے گوٹھ بسا لئے تھے۔ جنہیں ٹنڈو کہا جاتا ہے خداباد ہی کے ایک اور بااثر عامل ہندو دیوان گدو مل نے دریائی راستے سے حیدر آباد کا سفر کیا دریائی راستے سے گزر کر اسی نے جس جگہ خشکی پر قدم رکھا وہ جگہ آج بھی گدو مندر کے نام سے پہچانی جاتی ہے ہر چند کہ اس کا نام اب حسین آباد رکھ دیا گیا ہے بعد میں میروں نے اسے گدو بندر سے بلا کر قلعہ کے سامنے بسایا اس جگہ کو آج بھی گدوانی گھٹی کہتے ہیں۔ امیروں کے زمانہ میں مرزا خسرو بیگ گرجستان (جارجیا) سے یہاں آ کر آباد ہوئے جنہیں میر

صاحب نے اپنا مشیر خاص بنایا مرزا شاعری کرتے اور 'غلام' تخلص کرتے انہوں نے حیدر آباد ہی میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔

میروں کے دور میں حیدر آباد شہر نے بڑے شہر کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔ عمارات میں لکڑی کا کام کرنے والے ہنر مند کاریگروں کو خداباد سے یہاں لا کر بسایا گیا جس جگہ وہ لوگ رہے اس کا نام واڈھوں کا پڑ رکھا گیا اسی طرح مکان بنانے والے معماروں کو جنھیں سندھی زبان میں رازے کہا جاتا ہے یہاں لا کر آباد کیا۔ فوجی ضروریات کے لئے تیوراقوم کے لوگوں کو آباد کیا گیا یہ تلواروں کے چمکانے اوران کی دھار تیز کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔ اسی طرح رتنائیوں کے پڑ میں خیمے اور تنبو کے بنانے والے بسائے گئے اور گھوڑوں کے نعل لگانے والے ''نعل بندن گھٹی'' میں کلھوڑوں کے وقت سے رہ رہے تھے البتہ بزگر میروں کے دور میں آئے یہ نوبت اور نقاروں پر کھال منڈھنے کا کام انجام دیتے تھے۔ شہر میں گل انداز یا گولہ انداز بھی آ کر رہے یہ لوگ توپیں اوران کا بارود بناتے تھے۔ ان میں سے کچھ کلھوڑا دور سے ہی یہاں رہ رہے تھے جنہیں میر شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جس وجہ سے مشہور گولہ انداز شہباز خان روپوش ہو گیا تھا۔ بعد میں میروں نے گولہ اندازوں کو معافی دے دی میروں نے حیدر آباد کو ہر قسم کے کاریگروں سے سجایا اور شہر میں انہیں بسایا اوران میں سے کوری جولاہے کھنباٹی کپڑا رنگنے والے ''رنگریز'' اور زردوز پاٹولی ریشم کا کپڑا بنانے والے شامل تھے۔ ان کے علاوہ زرگر سنار کھٹی دھوبی پھنی گر کنگھیاں بنانے والے سراز جانوروں کی زین بنانے والے ٹھاٹھار (برتن بنانے والے) ساتھ ہی طبیبوں آخوندوں (یہ لوگ مدرسوں میں پڑھاتے) خدمت گاروں اور چھوٹے نوابوں کو بھی بسایا۔

سندھ پر حکمرانی کی سند میر فتح علی خان نے قندھار کو 24 لاکھ روپے ادا کر کے حاصل کی۔ میروں کی حکومت چویاری کہلاتی یعنی چار بھائیوں نے مل کر یاروں کی طرح حکومت کی جس کے پہلے سربراہ میر فتح علی خان تالپور تھے ان کی وفات 1802ء

کے بعد دوسرا بھائی میر غلام علی خان انتظامیہ کا سربراہ بنا۔ اس کے بعد تیسرا بھائی میر کرم علی خان پھر چوتھا بھائی میر مراد علی خان اس چویاری کا سربراہ بنا پھر میر نصیر خان کے دور میں سندھ میروں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ حیدر آباد پر میروں کی حکومت کم وبیش 60 سال 1783ء سے 1843ء تک رہی۔

الیگزنڈر برنس انگریزوں کی طرف سے والیٔ پنجاب رنجیت سنگھ کے لئے تحفہ لے کر دریائے سندھ کے راستے پنجاب جاتے ہوئے حیدر آباد میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ 1831ء کا واقعہ ہے وہ لکھتا ہے[34]۔ حیدر آباد پہاڑی پر واقع خوبصورت شہر ہے۔ یہاں شاندار قلعہ ہے جس کی دیواریں 20 سے 25 فٹ اونچی اور عمودی ہیں۔ چاروں اطراف کھائی ہے شہر کے دو اطراف پانی ہے ایک طرف دریائے سندھ دوسری طرف پھیلی ہے گھر زیادہ تر کچے اور مٹی کے بنے ہیں۔ امیروں کے گھر قیمتی نہیں مگر اچھی طرح بنے ہوئے ہیں۔ قلعہ کی دیواریں اتنی عمودی ہیں کہ انہیں زیر کرنا آسان نہیں''۔

اب اس قلعہ کو ختم ہوئے ایک عرصہ ہوا اور کہیں کہیں اس کی چار دیواری کے آثار بچے ہیں جہاں پر تجاوزات قائم کی گئی ہیں جو کسی وقت بڑے سانحہ کا باعث بن سکتی ہیں۔

کچا قلعہ حیدر آباد

حیدر آباد میں تین قلعے ہیں ایک پکا قلعہ ایک غلام شاہ کلہوڑا کا قلعہ اور تیسرا کچا قلعہ۔ یہ قلعہ پکے قلعہ کے مغرب میں سطح سمندر سے تقریباً 22 یا 25 فٹ بلند ٹیکری پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں مٹی کی اینٹوں یا بلاک سے بنائی گئی ہیں جس میں نو برج ہیں جو قلعہ کی دیواروں سے ملے ہوئے ہیں اور ایک بڑا دروازہ ہے جبکہ قلعہ کے اندر مکی شاہ بابا کے مزار کے علاوہ کئی گمنام قبریں ہیں گمان ہے کہ یہ لوگ کلہوڑوں اور میروں کے سردار یا دوسرے اشرافیہ میں سے ہوں گے قلعہ کے مغرب میں مکی شاہ بابا کا مزار ہے جس کے اوپر کثیر الاضلاع چھت اور گنبد ہے دیواریں منقش ٹائیلوں سے مزین ہیں

مزار کے اندرونی حصہ میں جے پور کا پتھر لگا ہے مزار کے علاوہ مسجد مسافر خانہ اور دفاتر ہیں مٹی کی یہ اونچی دیواریں دوڈھائی سوسالوں سے اسی طرح کھڑی ہیں جیسے حال میں بنی ہوں زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ میاں غلام شاہ کلہوڑا نے اس قلعہ کو اس لیے بنوایا ہوگا کہ وہ مغربی جانب سے آنے والے دشمنوں پر نظر رکھ سکے مگر اب تاریخ سندھ میں خداداد خان کا کہنا ہے کہ یہ قلعہ پہلے سے موجود تھا اور غلام شاہ کلہوڑا کے قلعہ سے زیادہ اونچا نظر آتا تھا لہٰذا غلام شاہ نے اسے ڈھا کر دوسرا قلعہ بنوایا مگر یہاں جو کتبہ نصب ہے اس سے تاریخ غلام شاہ کلہوڑا کے آنے سے سو سال قبل 1083ھ نکلتی ہے[35]۔

میروں کا پرانا دفتر اور خزانہ کی عمارت

پانچ کمروں پر مشتمل یہ عمارت پکا قلعہ کے مشرقی حصہ میں واقع ہے یہ کمرے میروں کے خزانہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور انگریزی عہد میں یہاں زمینوں کا دفتر ریکارڈ بھی محفوظ رکھا جاتا تھا یہ کمرے 20x40 فٹ کے ہیں جہاں محکمہ آثار قدیمہ نے میوزیم قائم کر رکھا تھا جہاں بھنبھور، منصورہ اور الور سے ملنے والی اشیاء کو رکھا گیا تھا اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے مسلمان حکمرانوں کے نوادرات بھی زیر نمائش رہے جن میں تالپوروں کی اشیاء بھی تھیں 1987ء میں بلوائیوں نے اس عجائب گھر کو لوٹ لیا اور عمارت جلادی آج یہاں پر پولیس تھانہ قائم ہے[36]۔

مقبرہ میاں غلام نبی

میاں غلام شاہ نے کامیاب حکومت کے بعد مستند روایت کے مطابق ۳ جمادی الاول 1186ھ/ 2- اگست 1772ء کو وفات پائی۔ مرزا قلیچ بیگ لکھتے ہیں کہ 1772ء میں قلعہ حیدرآباد کے جنوب مغرب میں ایک ٹیلے پر ایک کچے قلعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی تاکہ بڑے قلعہ کی حفاظت کے لئے چوکی کا کام دے سکے اس ٹیلہ پر میر محمد کی

کے مزار کے اردگرد ایک بڑا قبرستان تھا اور کئی قبریں قلعہ بنانے کی غرض سے صاف کرنی پڑیں۔اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد میاں صاحب فالج کے سبب فوت ہو گئے۔ قلعہ حیدرآباد کے متعلق عبدالمجید جوکیہ کا بیان ہے کہ میاں نے ایک مرتبہ فرمایا حکومت سندھ پشتوں سے ہمارے خاندان میں ہے لیکن اب تک کوئی ایسی عمارت نہ بنائی گئی جو ہماری حکمرانی کی یادگار بن سکتی میں ایک ایسا قلعہ بنانا چاہتا ہوں جو ہمیشہ کے لئے یادگار کے طور پر قائم رہے چنانچہ وہ جگہ تجویز ہوئی جہاں زمانہ قدیم میں نیرون واقع تھا۔میاں ایک دفعہ شکار کے لئے نکلا اور اس جگہ سے گزرا دیکھا کہ وہاں پانی کی کمی نہیں گردوپیش کی زمین سیراب ہے اور وہاں گھاس بہت ہوتی ہے قلعہ کی تعمیر کے لئے ایک مستحکم ٹیلہ موجود ہے چنانچہ وہاں تعمیر قلعہ کا حکم دیا اور بیچ میں ایک فوارہ بنوایا۔

قلعہ بھنبھور:

بھنبھور کے کھنڈرات خلیج گھارو کے شمالی کنارے نیشنل ہائی وے پر کراچی سے چالیس میل دور واقع ہیں یہاں پر 1958ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے کھدائیوں کا سلسلہ جاری ہوا ان کھنڈرات ایک خاصی بڑی بستی کے آثار ہیں جس کے دو حصے ہیں ایک تو مضبوط قلعہ بند شہر پناہ ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف 200 فٹ چوڑی اور شمالاً جنوباً 1200 فٹ طویل ہے۔اس کا دوسرا حصہ وہ بیرون شہر ہے جو ایک قدیم جھیل کے گرد شمال مشرق میں پھیلا ہے جبکہ اس کے دوسرے حصہ میں صنعتی علاقہ اور اس کے باہر ایک قدیم قبرستان بھی شامل ہے۔1958ء سے 1962ء تک یہاں جو کھدائیاں ہوئی ہیں ان کے نتائج کافی دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں ان کھدائیوں سے یہاں نہ صرف ایک وسیع ساحلی قلعہ بند شہر کے آثار کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہاں اس زمانے کے ابتدائی فن تعمیر اور دوسرے فنون لطیفہ کے متعلق بہت سی اشیاء بھی برآمد ہوئیں کے برتنوں کی جو بڑی تعداد یہاں سے دستیاب ہوئی ہے اس کی مدد سے محققین کو پہلی مرتبہ

اوائل مسلم دور کے ظروف کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اس جگہ سے سیتھی و پارتھیائی ہندو ساسانی اور ابتدائی اسلامی تین ادوار کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو پہلی صدی قبل مسیح سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی کے ایک طویل زمانے پر محیط ہیں۔ الکوک صاحب نے 1951ء میں جب وہ محکمہ آثار قدیمہ کے افسر تھے سرسری کھدائیوں سے معلوم کیا کہ بھنبھور کی بنیاد عربوں نے رکھی اور یہاں کی کسی چیز سے اس جگہ کا دیبل ہونا ثابت نہیں یہاں سے ملنے والی تمام قدیم اشیا اسلامی دور سے متعلقہ تھیں ان کھدائیوں سے نیچے بھی ہندوستانی دور کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوسکی لیکن بعد میں ہونے والی کھدائیوں کی بابت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد سن عیسوی کے آغاز میں یا اس سے بھی بہت پہلے رکھی گئی کیونکہ یہاں سے سیتھی اور پارتھیائی دور کی ثقافتی اشیاء بھی میسر آئی ہیں۔ جو پہلی صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی کے زمانہ کی ہیں۔ ان میں نفیس پالش شدہ مصفیٰ کوزے بھی شامل ہیں جن پر عنابی اور گہرے بادامی رنگ کی پالش ہے جو بلاشبہ یونانی کوزہ گری کی نقل معلوم ہوتی ہیں یہ کوزے بہت سبک اور نازک ہیں ان کی گردن پتلی اور سیدھی ہے اور ان میں سوراخ دار ٹوٹیاں لگی ہوئی ہیں اس قسم کے برتن سرجان مارشل کو ٹیکسلا کی کھدائیوں سے بھی ملے تھے۔ سیتھی اور پارتھیائی دور کے آثار کے عین اوپر ہندو ساسانی دور کی آبادی کے بہت سے حتمی شواہد ملے ہیں[37]۔ ان شواہد میں عمارتی آثار اور ثقافتی مال و اسباب دونوں شامل ہیں جہاں تک سندھ میں ساسانیوں کی موجودگی کا سوال ہے بنیادی ماخذات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکران سے لے کر بندرگاہ دیبل تک کے ساحلی علاقہ پر پانچویں صدی میں قابض ہو گئے تھے ساسانیوں کی حکومت کے دوران ایرانیوں کی بحری سرگرمی کافی تیز تھی چنانچہ 512ء میں سیلون کی دور دراز بندرگاہوں سے تجارتی مال کی نقل و حمل میں روم کے جہازوں سے ان کا مقابلہ اس کا بین ثبوت ہے اور یہی وجہ تھی کہ دیبل کے راستے تجارتی مال کی

آمدورفت کی وجہ سے ایرانیوں کو برصغیر کی ریشم کی تجارت میں اجارہ داری حاصل رہی اسی لئے انہوں نے رومی صارفوں سے ہمیشہ اپنی شرائط پر کاروبار کیا طبری نے بادشاہ بہرام گور (438-420ء) کی سندھ کی اس مہم کا تذکرہ کیا ہے جس میں بہرام گور نہ صرف ایک بیوی کے ساتھ وطن واپس آیا بلکہ اس نے جہیز میں دیبل، مکران اور سندھ کا علاقہ بھی حاصل کیا 485ء میں جب ساسانیوں کا اقتدار زوال پذیر ہوا تو اس وقت ساحلی علاقہ پر سندھ کے حکمران ہندو رائے خاندان کا تسلط قائم تھا۔

بھنبھور کی کھدائیوں سے قبل از اسلام کی جو عمارت نکلی وہ شیو مندر ہے جو قلعہ کے مغربی حصہ میں واقع ہے اس کی دیواریں کچی اینٹوں کی ہیں۔ جہاں سے یونی بمعہ لنگم ملا جس سے وہ ثبوت تکمیل کو پہنچا کہ یہاں ہندو آبادی تھی[38]۔ اسلامی دور میں یہاں اموی، عباسی دور کے آثار ملتے ہیں۔ اسلامی دور کے آثار میں قلعہ کی فصیل سب سے شاندار ہے اس کی موجودہ بلندی 19 فٹ ہے اس کے بیرونی رخ پر جو کھدائیاں ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فصیل کی ترمیم اور تعمیر کے چار دور گزرے ہیں۔ ابتداء میں فصیل بڑے اور بھارتی پتھروں سے بنائی گئی تھیں جن میں بعض تراشیدہ اور بعض ناتراشیدہ ہیں۔ یہ پتھر گارے سے ایک دوسرے کے اوپر جمائے گئے تھے اور مضبوطی کے لئے مساوی فاصلوں پر بڑے بڑے نیم مدور برج تعمیر کیے گئے تھے جو اور فصیل کو بھاری سنگین پشتے بنا کر مستحکم کیا گیا تھا یہ پہلی فصیل جس کی نمایاں خصوصیت مضبوطی اور پائیداری سے اس زمانہ کی نشاندہی کرتی ہے جب قوی استحکام تھا اور خوشحالی تھی، ابتدائی عباسی دور میں فصیل میں بہت سی ترامیم ہوئیں لیکن اس کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ فصیل کے اندرونی حصہ میں بھرائی کے لئے جو سخت پتھر استعمال ہوتے تھے ان کی جگہ کچی اینٹیں بھرائی گئیں اس کے بعد یعنی دسویں صدی عیسوی کے آخری زمانہ میں جو فصیل بنی وہ اگرچہ یہ ان بنیادوں پر بنی تھی لیکن اس کی چوڑائی اندر کی طرف سے کم کردی گئی تھی چنانچہ یہ اتنی مستحکم اور پائیدار نہ تھی جتنی کہ پہلی فصیل۔ اس

کے اندرونی اور بیرونی دونوں کنارے چھوٹے حجم کے پتھروں اور گارے سے بنائے گئے تھے اور درمیانی حصہ مٹی کی اینٹوں یا سخت اور کنکریلی مٹی سے بھرایا گیا بعد کے زمانہ میں اس فصیل کو جگہ جگہ سے توڑ کر گلیاں بنالی گئیں اور اس کے متصل رہائشی مکان تعمیر ہو گئے تھے جس سے فصیل کی دفاعی طاقت متاثر ہوئی۔

یہ آخری دور کی فصیل شہر پناہ کے صرف مشرقی حصہ کے گرد تھی اور اس کے دونوں رخ جو پتھر سے بنے تھے کمزور تھے اور درمیانی حصہ ریتلی یا بھوری مٹی سے بھرا گیا تھا، اس کی بنیادیں بہت کم گہری اور سطحی قسم کی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیرہویں صدی میں اس شہر پر زوال آیا اور سیاسی بدنظمی پھیلی تو اس کی تعمیر جلدی میں کی گئی تا کہ یہ ایک فوجی ناکے کا کام دے سکے کھدائی میں اب تک اس قلعہ کے 3 دروازے نکالے جا چکے ہیں مشرقی دروازہ جہاں سے تمام بیرونی شہر نظر آتا ہے جو قلعہ کو سیڑھیوں کے ذریعہ تالاب کے مشرقی رخ سے ملاتا ہے اور جھیل سے پانی لے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا اور یہ جھیل بالکل دروازے کے پہلو میں واقع ہے اس کے زینے جو اس وقت خستہ حالت میں ہیں۔ بقیہ دو دروازے اچھی حالت میں ہیں ان کے زینے نہایت عمدہ ہیں جو مصفا پتھروں سے تعمیر ہوئے تھے شمال مشرقی گوشہ والا دروازہ ایک محل نما نیم مدور مکان کو تالاب سے ملاتا ہے۔ یہ دروازہ دس فٹ چوڑا تھا جسے بعد میں پتھروں اور مٹی سے بند کر دیا گیا تھا اس دروازہ کے اگلے رخ پر پتلے چوڑے پتھر بچھائے گئے ہیں اور اس کے سامنے نیچے کی طرف پتھر کا پشتہ ہے جس کے اندر سے سیڑھیاں گزرتی ہیں جو مصفا پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ یہ سیڑھیاں سطح آب تک پہنچتی ہیں۔ لیکن ان میں شکست و ریخت نمایاں ہے جنوبی دروازہ جہاں سے سمندر نظر آتا ہے خاصی مرعوب کن عمارت ہے اس کے دونوں پہلوؤں میں نیم مدور اور مستحکم دو برج ہیں اور اس کے عقب میں ایک ڈیوڑھی ہے جس کی عمارت بھاری بھرکم اور پائیدار ہے دروازہ 8 فٹ چوڑا ہے اور اس کے کشادہ زینے جو مصفا پتھروں سے بنائے گئے ہیں

بہت اچھی حالت میں ہیں اور گودی تک پہنچتے ہیں جہاں اب سمندر ہے لیکن ایک زمانہ میں دریائے سندھ کا پانی آتا تھا۔ جنوبی دروازے کے سامنے لبِ ساحل جو عمارت واقع ہے وہ نصف کے قریب زیرِ آب ہے اور بہت مستحکم اور عمیق سنگین بنیادوں پر قائم ہے اس عمارت میں سمندر کی جانب ایک کھلا چبوترہ ہے جس میں تراشیدہ اور گنج دار پتھر اس طرح گاڑے گئے ہیں کہ گودی والے ستون معلوم ہوتے ہیں اور غالباً سامان سے لدی ہوئی دریائی کشتیوں یا بحری جہازوں کے ٹھہرانے کے لئے استعمال ہوتے اس وجہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ عمارت لنگر خانہ کا کام دیتی ہوگی شہر پناہ کے دامن میں ایک قدیم وسیع جھیل واقع ہے جس میں صدیوں سے آہستہ آہستہ مٹی جمع ہوتی رہی ہے اس میں نالوں کے ذریعہ برسات کا پانی جمع ہوتا تھا جو پینے کے کام آتا تھا اس جھیل کے سب کناروں پر پشتے بنے ہوئے ہیں یہ پشتے فصیل کی مضبوطی اور جھیل کے پانی اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے حفاظت کا ذریعہ تھے یہ پشتے اب تک کم وبیش 450 فٹ صاف ہو چکے ہیں۔ غیر محصور شہر تالاب کے اردگرد بہت دور تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے آثار شالی اور مشرقی سمت میں ایک میل سے زیادہ فاصلے تک ملتے ہیں۔ حصار قلعہ کے دامن میں مشرقی سمت جو کھدائیاں ہوئی تھیں ان میں ایک لمبی دیوار اور چند مدور کنویں نکلے ہیں شہر کے شمالی حصہ میں اور قلعہ کی فصیل سے باہر جو کھدائی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبادی میں ایک صنعتی علاقہ بھی تھا جو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بہترین جگہ یعنی تالاب کے کنارے بنایا گیا تھا آثار میں ایک کارخانہ کے ادھورے باقیات ہیں جس میں ایک بڑا ہال اور ایک گوشہ میں ایک وسیع کمرہ واقع ہے اور سامنے کے حصے میں چھوٹے کمروں کا سلسلہ ہے ہال اور کونے والے کمرہ میں مٹی کی بڑی بڑی ناندیں اس طرح جمائی گئی ہیں کہ ان کے پیندے فرش زمین سے ملحق ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی صنعت ضرور موجود تھی۔ سامنے کے کمروں میں سے ایک کمرہ میں جس کی دیواروں اور فرش پر نہایت جھلسی ہوئی سیاہ چونے کی استرکاری

ہے...... بعض آثار ایسے موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں برتنوں میں تیز حرارت کے ساتھ کوئی مائع تیار کی جاتی تھی اس قسم کے تین برتن جن پر آگ کا اثر ہے کمرے کے تین کونوں میں اب بھی موجود ہے۔

مٹی کے برتنوں کی ایسی قطاریں فصیل کے بالکل قریب بھی دریافت ہوئی ہیں اور بیرونی شہر میں کئی جگہ ان برتنوں کی بڑی تعداد دیکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ صنعت بہت مقبول تھی یہ بھی اتفاق ہے کہ دیبل بھی اپنے رنگنے کے کارخانوں کی وجہ سے مقبول تھا ایک اور عمارت جو شمال مشرقی گوشے والے برج کے دامن میں واقع ہے اور جو ابھی پوری طرح نہیں کھودی گئی بھٹی کی علامتیں کٹھالی کے ٹکڑے راکھ اور کوئلے کے ٹکڑے بھٹی کے اجزاء لوہے کے ریزے اور سیاہ پتھر کے روڑے جن میں لوہا موجود ہے اور کئی قسم کے لوہے کی اشیا ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوہار کا کارخانہ تھا۔ اس سے آگے شمال کی طرف ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جس پر راکھ بھٹی کے اجزاء اور شیشے کے ٹکڑوں کی بہتات ہے اس جگہ غالباً شیشے کا کارخانہ تھا۔ قلعہ میں دریافت ہونے والی سب سے اہم اور دلچسپ عمارت جامع مسجد ہے جو شہر کے درمیان واقع ہے مسجد میں جو سن واری کتبات دستیاب ہوئے[39]۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین مسجد ہے اور یہ کم وبیش مربع ہے اور اس کے اضلاع 122 فٹ x120 فٹ ہیں اس کی بیرونی دیوار جو تین سے چار فٹ چوڑی ہے پختہ اور پتھر کی ہے اور اچھی حالت میں ہے دیوار کی تعمیر میں مصفا پتھر استعمال ہوئے ہیں صحن میں جو 75 فٹ طویل اور 58 فٹ عریض ہے اینٹوں کا فرش ہے مسجد کے تین اطراف میں مسقف دالان اور غلام گردشیں ہیں جن کی چھت لکڑی کے قطار در قطار ستونوں پر قائم تھی کھدائیوں سے جو آثار ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دالان چھوٹے چھوٹے حجروں میں تقسیم تھے اور ہر حجرہ اوسطاً 11 فٹ یا 9 فٹ تھا چوتھی طرف یعنی مغربی سمت میں ایک وسیع ایوان ہے جس کی چھت 33 ستونوں پر قائم تھی جو تین

قطاروں میں ایستادہ تھے ان ستونوں کے پتھریلے پائے اچھی حالت میں ہیں۔ کھدائی میں ان کے گرد جلی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے بھی ملے تھے اس کے علاوہ یہاں مٹی پر منقش لکڑی کے نشانات بھی پائے گئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ستون تراشیدہ منقش لکڑی کے تھے بعض پایوں پر عمدہ نقش و نگار کندہ ہیں اس قسم کے منقش پتھر مسجد کی مختلف دیواروں اور عمارت سے بھی ملے ہیں مسجد کی کئی دلچسپ چیزوں میں ایک وضو کرنے کا چبوترہ ہے جس کی موٹی تہ پر چونے کا پلستر ہے یہ چبوترہ شمال مشرقی گوشے کے قریب واقع ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں یہ چبوترہ گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس پر مٹی کے چراغ رکھے جاتے تھے چنانچہ فرش پر ان چراغوں کا ایک ڈھیر بھی ملا ہے اس چبوترے کے قریب ایک سنگ بستہ اور پختہ نال ہے جس کے ذریعہ صحن میں جمع ہونے والا برسات اور وضو کا پانی باہر نکل جاتا۔ نالی سے وضو کے لئے استعمال ہونے والے لوٹوں کے ٹکڑے بھی ملے ہیں۔

مسجد کے دو بڑے دروازے تھے جو مشرقی اور شمالی سمت واقع تھے اور ایک چھوٹا دروازہ مغربی سمت تھا جس کے ساتھ سیڑھیاں بھی تھیں مسجد کے اندر اس دروازے کے قریب ایک بڑے کوفی کتبے کے ٹکڑے بھی ملے۔ شمالی دروازہ 7 فٹ چوڑا ہے اس کے ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں محراب کے بغیر مسجد کا پورا خاکہ جامع مسجد کوفہ و مسجد واسط سے ملتا ہے [40]۔ جو علی الترتیب 670 اور 702ء میں تعمیر ہوئی تھی مسجد میں پہلی مرتبہ محراب خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں بنی یہ محراب مسجد نبوی کی تعمیر نو 707ء - 709ء میں بنائی گئی۔ یہ مسجد آٹھویں صدی میں بن کر تیرھویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔

احاطہ مسجد سے ملنے والی تمام اشیا میں کوفی خط کے کتبے جو مصفا پتھروں پر کندہ ہیں اب تک یہ چودہ کی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں [41]۔ ان میں سے دو کتبوں پر علی الترتیب 109ھ (727ء) اور 294ھ 906-907ء سنین درج ہیں فتح دیبل کا زمانہ تعمیر مسجد کے زمانہ سے جو پہلے کتبے سے ظاہر ہے بہت قریب ہے افسوس ہے کہ کتبہ کا وہ

حصہ جس پر سن درج ہے بڑی خستہ حالت میں ہے۔ جو مکمل وثوق کے ساتھ نہیں پڑھا جا سکا۔ دوسرا کتبہ جو تین پتھروں پر پھولدار کوفی خط میں ہے اس پر 294ھ کی تاریخ رقم ہے بعض کتبوں میں خلفائے وقت اور مقامی گورنروں کے نام بھی درج ہیں اور ان میں بعض ایسی معلومات بھی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

پہلا کتبہ

(۱) بسم الله الرحمن الرحيم

(۲) مما امربه الامير هرون بن محمد مولى امير المؤمنين اعزه

(۳)الله على يدى على بن عيسى مولى (۴)امير المؤمنين اكرمه الله سنة تسع و ثلثين (۵)ومائتين۔

ترجمہ: بسم الله الرحمن الرحيم

امیر المؤمنین امیر ھرون بن محمد مولی امیر المؤمنین اللہ اس کی عزت بڑھائے نے علی بن عیسیٰ مولیٰ امیر المؤمنین اکرمہ اللہ کے توسط سے اس کی تعمیر کا حکم دیا تھا[42]۔

239ھ مطابق (853-854ء)

دوسرا کتبہ:

بسم الله الرحمن الرحيم . لا اله الا الله (وحده) وان محمد رسوله وعبده (۲) انما يعمر مسا(جد) الله من امن بالله واليوم الاخر واقام (الصلوة واتى) لزكاة ولم يخش الا الله فعسا اولئک ان يكونوا من المهتدين هذا مما امر بنصبه محمد بن عبدال ...... (له) ال (قو) ده سنه اربع و تسعين و مائتين .

ترجمہ: بسم الله الرحمن الرحيم لا اله الا الله وان محمد عبده و رسوله صرف وہی شخص اللہ تعالیٰ کی مسجد آباد کرتا ہے اور سوائے اللہ کے کسی سے نہیں

ڈرتا۔ یہی لوگ راست پر ہو سکتے ہیں جو امیر محمد بن عبداللہ کے حکم سے ذیقعدہ 294ھ (906ء) میں نصب ہوا، اس قلعہ میں جامع مسجد کے شمال میں ایک نہایت وسیع عمارت ہے جس کے متعلق گمان ہوتا ہے کہ یہ مسجد سے ملحق مدرسہ کی عمارت ہے۔ یا سرکاری نظم و نسق کی کوئی عمارت۔ اس کا ایک بہت شاندار دروازہ اور ڈیوڑھی ہے جو مسجد کے شمالی دروازہ کے بالمقابل کھلتا ہے اس میں طویل و عریض غلام گردشیں ہیں اور ان کے دونوں اطراف باقاعدہ کمروں کا سلسلہ ہے اس عمارت کی بنیادیں بہت گہری اور پتھروں کی بنائی گئی ہیں جن پر کچی اینٹوں کی چوڑی چوڑی دیواریں اور دیواروں پر مٹی کا پلستر ہے اسی قسم کی ایک اور عمارت مسجد کے مشرق میں واقع ہے یہ بھی کچی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔

قلعہ کے شمال مشرقی گوشہ میں ایک اور قابل دید عمارت ہے یہ نیم مدور پتھر کا بنا ہوا محل نما مکان ہے جس کی دیواریں بہت چوڑی اور پائیدار ہیں اور فرش پر چونے کا پلستر ہے اس کے اندر ایک بڑا گول کنواں ہے جس کے ساتھ ایک نال ہے اور باہر کئی سنڈاس ہیں جھیل تک جانے کے لئے ایک عمدہ دروازہ بھی ہے اس عمارت سے ابتدائی اسلامی زمانے کی بہت سی عمدہ اشیاء ملی ہیں جن میں بعض کی تاریخ بھی متعین کی جاسکتی ہے شہر پناہ کے شمالی حصہ میں ایک اور کچی اینٹ کا بنا ہوا بڑا مکان بھی موجود ہے جس کی غیر معمولی ضخیم دیواریں اور گہری بنیادیں ہیں یہ مکان بھی ابتدائی اسلامی زمانے کا ہے۔

پکی اینٹ کے مکانات بہت کم ہیں اب تک صرف ایک بڑے مکان کا پتہ چلا ہے جو شمالی حصہ میں واقع ہے اس مکان کے فرش پر چونے کا پلستر کیا گیا ہے جہاں سے عباسی خلیفہ واثق باللہ 842-847ء کا سونے کا سکہ بھی ملا ہے۔ اسلامی دور کے رہائشی مکانات کے بے شمار آثار ٹیلے کے مختلف حصوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر خاصا سلیقے سے آباد کیا گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھنبھور کا زوال تیرھویں صدی میں ہوا اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں دریا نے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور دوسرا اسی زمانہ میں یہاں

شدید ہنگامہ برپا ہوا تھا جس کے نشانات کھنڈرات میں ملتے ہیں۔ یہاں سے ملنے والے ڈھانچوں کی کھوپڑیاں تیروں سے چھیدی ہوئی اور مکانات جلے ہوئے ہیں جن سے کسی حملہ آور کی آمد کا سراغ ملتا ہے یہاں سے کھدائی کے دوران اموی اور عباسی ادوار کے برتن چینی کے برتن مٹی کے عام گھریلو برتن۔ اسلامی دور کے بڑے مرتبان، اسلام سے قبل کے سکے اور خلیفہ واثق باللہ کے عہد کا طلائی سکہ چاندی اور تانبے کے سکے اور ان کے سانچے اس کے علاوہ شیشے کی مصنوعات ہاتھی دانت اور ھڈی کی بنی ہوئی اشیاء لوہے کی اشیاء تانبے کی اشیا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ جن کا تعلق فنون لطیفہ، فن تعمیر اور صنعت وحرفت سے ہے۔

سندھ کی ابتدائی مسلم ثقافت تمدن اور تاریخ کے بارے میں ان سکوں، کتبوں، برتنوں سے سیر حاصل معلومات حاصل ہوتی ہیں اب تلک ملنے والی معلومات پر انحصار کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ بھنبھور ہی دراصل دیبل ہے۔

منصورہ

اب ہم منصورہ کی طرف آتے ہیں یہ شہر موجودہ شہداد پور ضلع سانگھڑ کے جنوب مشرق میں آٹھ میل کے فاصلہ پر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے جمراؤ نہر کے بائیں کنارے پر ٹیلے نظر آتے ہیں یہ ٹیلے سندھ میں عرب شہر المنصورہ کے ہیں جسے عامر ثقفی نے 110ھ/728ء اور 120ھ/737ء میں آباد کیا۔ عامر مشہور عرب جرنیل محمد بن قاسم کا بیٹا تھا۔ عامر سندھ میں 105ھ/723ء میں آیا اور حکم بن عوانہ الکلبی کے ڈپٹی گورنر کی حیثیت سے کام کیا عوانہ الکلبی نے بکھرے مسلمانوں کو اس خطہ میں اکٹھا کیا اور اسے المحفوظہ کا نام دیا گیا۔[43] ہباریوں کے تحت پر ایک بڑا شہر تھا جس کی شہر پناہ موجود تھی۔ اس زمانے کے مؤرخین اور جغرافیہ دان اور سیاح جن میں بلاذری المسعودی الاصطخری[44]۔ ابن حوقل المقدسی بزرگ ابن شہریار۔ ابن حزم۔ الادریسی یاقوت الحموی۔ قزوینی۔ ابن اثیر۔ البیرونی۔ ابن خلدون الواقدی نے اس

بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

المقدسی بشہیاری نے اسے دمشق کا ہم پلہ شہر قرار دیا۔ اس کے مطابق یہاں گھر لکڑی اور مٹی کے بنے تھے اور مسجد شہر کے وسط میں پتھر اور اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اور شہر پناہ میں چار دروازے تھے جن کے نام باب البحر۔ باب التوران۔ باب السندان۔ اور باب الملتان تھے اس میں دارالامراء سکول اور کالجز اور سرائے موجود تھیں [45]۔ یہ ہباریوں کے تحت وہ آخری شہر تھا جو حملہ آوروں سے تیرھویں صدی میں تباہ ہوا [46]۔

1854ء میں حیدر آباد کے کمشنر اے ایف بلاسنز نے یہاں ان آثار کو دیکھا اس نے اس شہر کو برہمن آباد کا نام دیا۔ اس کے مطابق اس شہر کی دیواریں 3 میل 7 فرلانگ 180 گز تک تھیں جو گری ہوئی دیواروں اور ٹیلوں پر مشتمل تھا اس کے برج بھی عمر کوٹ یا حیدر آباد کے قلعہ کی طرح تھے اس کے 41 سال بعد 1895ء میں ایک اور برطانوی ماہر آثار قدیمہ ہنری کوسنس نے اس جگہ کو دیکھا اور لکھا کہ یہاں کھنڈرات ریت کے ٹیلے پر اینٹوں کے ڈھیر اور ٹھیکریوں کے ڈھیر کی شکل میں پڑے ہیں انہی سالوں میں اس ماہر آثار قدیمہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کھنڈر برہمن آباد کے ہیں اور المنصورہ شہر کے بارے لکھا کہ یہ برہمن آباد کے کھنڈر پر بنا جبکہ 75 سال بعد پاکستان آثار قدیمہ کے ماہرین نے یہاں کھدائیوں سے ثابت کیا کہ یہ شہر کھنڈروں کی بجائے صاف سطح زمین پر بنایا گیا تھا بہر حال یہ نظریہ ابھی تک تحقیق طلب ہے۔

شہر پناہ کے 1200 کے قریب برج ہیں ان آثار کو جتنا نوادرات کو لوٹنے والوں نے لوٹا ہے ان میں وہاں کے کسان بھی ہیں جنھوں نے وہاں سے نوادرات کے ساتھ ساتھ اپنے لیے تعمیر شدہ گھروں کے لئے اینٹیں بھی وہاں سے حاصل کیں۔ یہاں سے ملنے والے سکے۔ برتن اور شہر پناہ کے دروازے کے کانسی کے کنڈے اور رہائشی عمارات کے نشانات کے علاوہ دارالامراء جیسی عمارات کے آثار ان کی عظمت کی دلیل ہیں یہ کانسی کے کنڈے آج نیشنل میوزیم پاکستان کراچی میں موجود ہیں [47]۔ جن کا

سائز پلیٹ کا ڈیامیٹر 56 س م جبکہ پلیٹ کے اندرونی سوراخ کا ڈایامیٹر 24.20 سنٹی میٹر اور اس کا محیط 173 س م اور اندرونی سوراخ کا ڈایامیٹر 76 س م اور اس کی موٹائی 1.00 سن م اور اس کی شکل کا ابھار 17 س م اس کا وزن 38 کلوگرام اس طرح اس کا کل وزن 54.00 کلوگرام جس پر گولائی میں مندرجہ ذیل عبارت رقم ہے۔

بسم الله الرحمن الرحیم لا اله الا الله محمد رسول الله للامیر
عبدالله بن عمر

جبکہ دوسرے پر

بسم الله الرحمن الرحیم فسکفیکهم الله وهو السمیع العلیم
للامیر عبدالله بن عمر

اس کے علاوہ

بسم الله الرحمن الرحیم کله من الله للامیرعبدالله بن عمر
اطال الله فی العریفاه

بنو امیہ کے دور میں المنصورہ شہر ایک جدید فوجی چھاؤنی تھا جو ھباریوں کے ثقافتی مرکز کے طور پر ابھرا اور اس شہر نے سندھ میں عربوں کی حکومت کو مضبوط کیا یہ شہر زمانہ خلافت میں بسنے والے شہروں کے ہم پلہ تھا۔ اس کی چار دیواری بعد میں بنائی جانے والی عمارتوں میں دب کر رہ گئی اور اس کے چار دروازوں کے نام ان سمتوں کے حوالے سے رکھے گئے مسجد اس شہر کے مرکز کی حیثیت رکھتی اور برصغیر میں منصورہ کی مسجد میں پہلی محراب کے آثار ملتے ہیں جو مسجد کی مغربی دیوار میں ہے بھنبھور میں واقع مسجد کے آثار سے یہ ترقی یافتہ تھی، ہوسکتا ہے یہ دوسرے ھباری حکمران نے متعارف کرائی ہو جس نے دارالامراء کی عمارت اس مسجد کے قریب بنائی۔ جنوبی جانب ایک

اور محراب اسی سائز کی موجود تھی جو مقصورہ کو ظاہر کرتی تھی جو کہ برصغیر میں اس نوعیت کی پہلی مثال ہے[48]۔ مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی فتوحات کیں وہاں انہوں نے اپنے فن تعمیر بالخصوص مساجد کی تعمیر میں کام کیا۔ جامع مسجد المنصورہ کے علاوہ آبادی میں مقامی لوگوں کے لئے اور بھی مساجد تعمیر کی گئیں۔ اگر دروازے کے کانسی کے کنڈوں کی خطاطی کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی خط ہے جس کے کتبے بھنبھور سے ملے تھے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان پر بازنطینی اثرات نمایاں ہیں۔ یہاں سے ملنے والے برتن، گلدان اور سکے۔ اس شہر کے باسیوں کی قابلیت کے غماز ہیں۔

آثار منصورہ شہر

رقبہ 392.3 ایکڑ دیہہ جام راؤ تعلقہ سنجھر و شہداد پور ضلع سانگھڑ سے 18 کلومیٹر جنوب مشرقی سمت واقع ہے جو کھنڈرات کی شکل میں ہے محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جو کھدائیاں کی گئی ہیں۔ اب وہ بھی سیم کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہیں مقامی لوگوں نے جنوب مشرق اور مغربی سمت تجاوزات قائم کر رکھی ہیں[49]۔

ٹیلہ تھل

دیہہ کوٹ بجر تعلقہ سنجھورو ضلع سانگھڑ۔ رقبہ 16.036 ایکٹر

یہ ٹیلہ شہداد پور ریلوے اسٹیشن سے 15 میل مشرق اور تقریباً 50 میل حیدر آباد کے شمال مشرق شہداد پور۔ سانگھڑ روڈ پر واقع ہے۔ جنوبی سمت سے یہ ٹیلہ 1/2 میل پانی کے اندر واقع ہے جہاں پر برتنوں کے ٹکڑے اور پکی اینٹیں موجود ہیں جن میں رنگین اور عام برتنوں کی ٹھیکریاں ہیں رنگین سرخ برتنوں پر کالے دائرے اور برتنوں کی سطح ملائم کر کے سرخ اور زرد رنگوں سے نکھارا گیا ہے[50]۔ ایسی مثالیں ہیں بھنبھور کی اوپری سطح سے ملتی ہیں۔

کھنڈرات بدین پرانا شہر

G05203/GD/23-4-1921 رقبہ 18.9 ایکٹر

18.9 ایکٹر اس پرانے شہر کے کھنڈرات کی نشاندہی لہری بندر کے طور پر محسن خان پٹھان 18 ویں صدی کے اواخر میں کی یہ آثار آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں اب 1-8.9 ایکٹر اراضی تجاوزات کی زد میں ہے۔

ٹیلہ بھیرو بھام

گاؤں بانڈھی سے 3 میل جنوب کی طرف امیر جی نہر کے پاس یہ ٹیلہ ہے جسے بھیرو بھام کا ٹیلہ کہا جاتا ہے جو تقریباً 40 ایکڑ میں ہے اور دو حصوں میں منقسم ہے اصل ٹیلہ شمال کی طرف سے جو 25 ایکڑ میں شمالاً جنوباً ہے اور کھیتوں سے 15 فٹ اونچائی ہے اس کی سطح ٹھیکروں اور اینٹوں کے ٹکڑوں سے اَٹی پڑی ہے اور چند جگھوں پر رہائش کا کام بھی نظر آتا ہے جو پکی اینٹیں یہاں استعمال ہوئی ہیں ان کا سائز "12 x 91/2" x2" ہے اس جگہ شہر کی چار دیواری کے نشانات بھی ملتے ہیں [51]۔ دراصل جنوب مغربی کونہ جو نظر آتا ہے اس کو مقامی کاشت کاروں نے پوری طرح سے ظاہر کر دیا ہے جو یہاں سے مٹی لیتے ہیں مٹی کے برتنوں کی ٹھیکریاں پورے ٹیلہ پر بکھری پڑی ہیں یہاں رنگین ٹھیکریاں کم ہیں جو بھنبھور سے ملنے والی ٹھیکریوں سے مشابہت رکھتی ہیں ان پر ڈیزائن کالے اور بعض اوقات سرخ رنگوں کے ہیں۔

قلعہ جام بجر میرپور ساکرو

دیہہ پیلے جام رن پٹھانی ریلوے اسٹیشن

یہ دراصل قلعہ نہیں بلکہ ایک اونچا چبوترہ سا ہے اس کے سامنے ماتھے پر ایک دیوار ہے جس کے مینار ہیں۔ اس چبوترہ کے کونے میں ایک اور چبوترہ ہے جو غالباً جام بجر کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

ٹیلہ دم بھٹی (دیہہ نرپیور تعلقہ سیہون ضلع جامشورو)

یہ جگہ جہانگیر ٹاؤن کے جنوب مغرب میں 10 کلومیٹر کے فاصلہ پر بندھنی گاؤں کے شمال مغرب میں اور لکا گاؤں سے 7 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے اس کے شمال مشرقی حصہ پر ایک پہاڑی کے 1/4 حصہ پر موجود ہے جہاں مقامی لوگوں نے تجاوزات کی بھرمار کر رکھی ہے شمالاً جنوباً یہ 320 میٹر جبکہ 300 میٹر شرقاً غرباً ہے اور 26 میٹر اونچی ہے اس کا کل رقبہ 96000 مربع میٹر ہے[52]۔

معصوم جی بھٹی (دیہہ کرچھٹ محل ضلع جامشورو، "زمانہ ماقبل تاریخ")

یہ ٹیلہ 271 فٹ اونچا 759 فٹ لمبا اور 680 فٹ چوڑا ہے اور کراچی سے جنوبی سمت ایک میل کے فاصلہ پر ہے جو سلسلہ کیرتھر ہائے کوہ موجودہ شمال اور مغرب کمبو اور دھیرو پہاڑیوں میں واقع ہے یہاں پر موجود قبور سے پتھر اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں اور مقامی لوگوں کی طرف سے یہاں تجاوزات کا سلسلہ جاری ہے۔

کوہ تراس بھٹی (دیہہ کرچھٹ تحصیل کوہستان ضلع جامشورو)

یہ جگہ کیرتھر اور کلیرو کے درمیان اور گن بولتھ سلسلہ کے شمال میں واقع ہے اس جگہ کالی مٹی کے ظروف اور پتھروں کا ایک کنواں موجود ہے یہ سائٹ لمبائی میں 229 میٹر اور چوڑائی میں 207 میٹر اور اونچائی میں 8 میٹر ہے یہاں سے ملنے والی اشیاء سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جگہ Muture Harppan Phase کی نمائندگی کرتی ہے یہاں سے ملنے والے برتنوں کے نمونے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا تعلق بلوچی روایات سے بھی تھا اور ان کے برتنوں کو آمری سے ملنے والے برتنوں سے بھی مماثلت ہے یہاں سے گہرے براؤن چرٹ پتھر کے اوزار بھی ملے۔ اسی طرح سیپ کی چوڑیاں اور مٹی کے چھکڑے اور پتھروں کے موتی اور تانبے کے ٹکڑے اور سوئی بھی ملی۔

اوتھام جو بھٹی (دیہہ کرچھٹ تعلقہ محل کوہستان ضلع جامشورو)

دریائے باراں کے پاس دیہہ کرچھٹ اور عرب جو ٹنڈو اور واہی گاؤں اور شمال مغربی بچانی سندھی موہل کوہستان کے راستہ سے پر ایک غیر معروف سی جگہ ہے جہاں سے ملنے والا میٹریل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ جگہ زمانہ قبل تاریخ سے متعلقہ ہے یہ ٹیلہ 800x1000 فٹ پر محیط ہے اور دریائے باراں سے یہ جگہ 50 فٹ اونچائی پر ہے یہاں سے برتنوں کے ٹکڑے بارش سے بہہ کر نیچے آ چکے ہیں۔

قلعہ سیہون تعلقہ سیہون ضلع جامشورو رقبہ 16.0 ایکٹر

قصبہ سیہوان کے شمال میں ایک عظیم الشان قلعہ کے آثار موجود ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے بنوایا تھا مگر یہاں سے ماسوائے ایک سکے کے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ اس کو سکندر نے تعمیر کرایا تھا اس کی تہہ میں سے ہندوؤں کے زمانہ کی بڑے سائز کی اینٹوں کے نمونے ملتے ہیں جو سن عیسوی کے شروع کی ہو سکتی ہیں اس قلعہ کا داخلی راستہ کون سا ہے؟ جس کے بارے مشکل سے ہی کہا جا سکتا ہے کہ جنوب مشرقی کونے میں کہیں ہو سکتا ہے جہاں آج سڑک ہے بعض مرتبہ ایسے لگتا ہے جیسے یہ قلعہ کم از کم دو مرتبہ مسلمانوں نے اس کی عام بلندی سے زیادہ بلندی پر بنایا آج یہ قلعہ ایک ٹیلے کی صورت میں ہے جو 400x200 مربع گز پر محیط ہے اور تقریباً 60 فٹ اونچا ہے جو ٹھیکریوں، اینٹوں اور ہڈیوں اور چونے کی راکھ سے بھرا پڑا ہے قلعہ کی کچھ تعمیر اس کی بناوٹ کے مختلف ادوار کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔

رنی کوٹ کا قلعہ (رقبہ 160 ایکڑ 711-AD)

محال کوہستان دیہہ رنی کوٹ ضلع جامشورو

پاکستان صوبہ سندھ کے شمال مغربی کونے کیرتھر سلسلہ جو 27.55 شمالی طرف سطح



کافر کوٹ فورٹ



سبی فورٹ



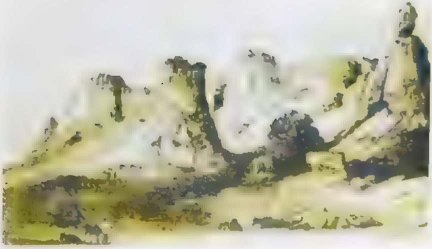
اسلام گڑھ فورٹ



رنی کوٹ فورٹ



رنی کوٹ فورٹ



سہون فورٹ

مرتفع سے جنوبی جانب صوبے کی مغربی سرحد تک 26.150 سطح مرتفع پر واقع ہے، یہ سلسلہ 25.43 سطح مرتفع پر جا کر ختم ہوتا ہے اس طرح اس کی کل لمبائی 150 میل تک بنتی ہے جبکہ یہ سطح چار ہزار سے پانچ ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہے، ان پہاڑیوں پر زیادہ تر چونا اور ریتلا پتھر وغیرہ ملتے ہیں۔ جیالوجیکل بناوٹ سے یہ علاقہ معدنیات سے بھرا پڑا ہے۔

اس علاقے میں دنیا کا سب سے بڑا قلعہ واقع ہے جو رنی کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اور بھی نام ہیں۔ جیسے رونی کوٹ، رانیکا کوٹ، موہن کوٹ یہ موضع سن ضلع دادو کے جنوب مغرب میں واقع ہے سن۔ حیدرآباد کے شمال کی طرف 56 میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اس قلعے کے محیط 18 میل کے لگ بھگ ہے[53]۔ دور سے یہ قلعہ کی بیرونی چار دیواری دیوار چین کی مانند معلوم ہوتی ہیں جو وادی پہاڑیوں اور مشکل گذرگاہوں سے گزر کر جاتی ہے جو یقیناً فوجی تعمیر کے نقطہ نظر سے اہم ہے۔

یہاں تک پہنچنے کا راستہ انتہائی دشوار ہے اور وہ سڑک جو موضع سن تک جاتی ہے انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ سن ریلوے اسٹیشن جنوب مغرب کی طرف ہے۔ درحقیقت یہ کوئی سڑک نہیں جس کو کوئی نام دیا جائے۔ جیپ میں اس قلعہ کو گھومتے دیکھنے کے لئے ڈیڑھ سے 2 گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ قلعہ تک پہنچنے کے راستہ کو سڑک کہیں یا کچھ اور بہر حال قلعہ تک جاتی ہے۔

قلعہ تک پہنچنے والے راستوں میں ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح ایک بڑی عمارت کو خشک ندی کے دائیں اور بائیں کنارے پر دیکھ سکتے ہیں۔ قلعہ کا داخلی دروازہ اگر اسے دروازہ کہنا موزوں ہو تو عمدہ کاریگروں کا نمونہ ہے ایک پانی کی خندق پر پل کی طرح کا دروازہ جو اب موجود نہیں ہے قلعہ کے اندرونی جائزہ سے اس کی حیران کن بناوٹ نظر آتی ہے۔ اس طرح ہر کوئی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ کافی عرصہ قبل جب یہ قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اس وقت یہ جگہ انتہائی زرخیز وادی تھی جہاں صاف پانی بہتا تھا۔ اس وقت یہ

انتہائی بارونق علاقہ تھا۔ سر ولیم نیپیر نے اپنی مرتب شدہ سندھ رپورٹ میں لکھا ہے[54]۔

Vast tracts of fertile but uninhabited land, and many anciently peopled site, where also dicovered, showing that the riches and magnificence attributed to scinde in formour days where not exagerated and that the right road was being followed to restore than again. One of the those ancient posts was very remarkable. Noted the maps as Mohun Kote, It is called by Sir Alexander burnens a fortified hill, but the country people know it by the name of Renne kote, and it was found to be a Rampost of cutstone and mortar, encircling not one but many hills, being fifteen miles in circumference and having within in a strong Perenail streem if purest water gushing from a rocke. Greek the site was supposed to be yet no Greek workmanship or ruins were there, and the amears having repaired the walls had the credit of building them.

بے شک صاف پانی کی اس جھیل کے اردگرد آبادی ہوگی مزید برآں بارشوں کے موسم میں جھیل کا پانی پلوں کی شکل میں کھلنے والے دروازوں کے نیچے بہتا تھا۔ جنھیں سن اور آمری دروازہ کہتے تھے۔ ان کا دوہرا مقصد تھا۔ ایک تو یہ کہ ان سے پانی کی مقدار میں اضافہ ہوتا۔ اور یہ پوری وادی تک پہنچ پاتا۔ دوسرا مقصد دفاعی تھا اس جگہ کے زرخیز ہونے کی وجہ یہی جھیل اور ڈیم ہے اور حملہ آوروں کے لئے کشش کا باعث تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان حملہ آوروں سے بچنے کے لئے مقامی حکمرانوں نے اسے تعمیر

کرایا ہوگا یہ کب تعمیر ہوا ہوگا اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

دروازے

دروازے باہر سے اتنے قدیم نظر نہیں آتے جتنا کے داخل ہوتے ہوئے۔ اس قلعہ کے چار داخلی دروازے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) سان یا مشرقی دروازہ

(۲) آمری دروازہ یا شمال مشرقی دروازہ

(۳) شاہ پر دروازہ یا جنوبی دروازہ اور

(۴) بالائی دروازہ یا مغربی دروازہ (سیہان دروازہ)

مشرقی یا سان دروازہ کا نام ایک چھوٹے سے گاؤں کے نام پر رکھا گیا ہے جو کہ قلعے کے مشرق میں 18 میل کے فاصلے پر ہے۔ آمری دروازہ کا نام ایک تاریخی مشہور اور اہم جگہ ''آمری'' کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس جگہ کی کھدائی دو مرتبہ مشہور و معروف ماہر آثار قدیمہ نے کی اور یہ جگہ اپنی تہذیبی اعتبار سے جانی جاتی ہے۔

آمری سان کے شمال میں 15 میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے ساتھ اس روڈ پر واقع ہے جو لاڑکانہ کی طرف جاتا ہے۔ یہ اس قلعہ کے قدیم آثار کی طرف بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے یہ قلعہ شاید اس وقت تعمیر کیا گیا جب آمری ثقافت پھیل رہی تھی اور اسی وجہ سے اس شمال مشرقی دروازہ کا نام اس مشہور جگہ کے نام پر رکھا گیا۔ اس زمانے میں یہ روایت بھی قصبوں اور قلعوں کے دروازوں کے نام مشہور جگہوں کے نام پر رکھے جاتے تھے۔

جنوبی یا شاہ پر دروازہ، آمری دروازے سے نچلی سطح پر واقع ہے۔ مشرقی یا سان دروازہ سب سے نیچے ہے اور آخری یعنی مغربی دروازہ بالائی دروازہ (سیہان دروازہ) ہے جو قلعے کی بالائی جانب واقع ہے۔

قلع کی اندرونی دیوار میں دو اور بناوٹیں واقع ہیں۔ جو کہ چھوٹے قلعے کی طرح ہیں۔ ایک چوٹی پر اور دوسری اس سے نچلی سطح پر ہے۔ نچلے قلعے کا نام ''مری'' اور بالائی قلعہ نما جگہ ''شیر گڑھ'' کے نام سے جانی جاتی ہیں یہ دونوں رہائشی قلعے ہیں اور یقیناً اس حکومت کے سربراہ کے زیر استعمال رہی ہوں گی[55]۔ ''مری'' قلعہ تقریباً اس قلعہ کے مرکز میں ہے۔ یہ اندازاً سان دروازہ سے 3 میل پر ہے۔ اور مغربی دروازہ سے مزید 2 میل ہے۔ اس فاصلے کا اندازہ سفر کے دورانیے سے لگایا گیا ہے۔ اس سارے قلعے کا قطر 5 میل ہے۔ اور محیط تقریباً 15 سے 18 میل ہے۔ اگرچہ یہ Cirumference ایک سیدھی لائن میں نہیں پھر بھی یہ نگاہ سے دور نہیں ہوتا۔ یہ ایک پیچیدہ دیوار ہے جو پہاڑی کے اوپر اور نیچے جاتی ہے۔ Hughes کے خیال میں اس قلعے کا پھیلاؤ 15 میل اور جی ایم سید کے خیال میں 18 میل ہے۔ محیط کی پیائش 14 میل اس نقشے کے مطابق جو یہاں پر ازسرنو بنایا گیا۔ اور اگر وادی کے اوپر یا نیچے کی طرف جائیں تو یہ محیط تقریباً 16 یا 17 میل بنتا ہے[56]۔

جن دو قلعوں کا ذکر کیا گیا یہ عملی مقاصد کے حساب سے رقبے کے تقریباً وسط میں واقع ہیں اور لشکر کشی کے حوالے سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں ان دو قلعوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا جب میں ان کی تاریخ تعمیر کا ذکر کروں گا۔ پوری وادی ان دو قلعوں سے نظر آتی ہے۔ یہ دونوں قلعے جنگ کے وقت دوسرے اور تیسرے درجے کے مورچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دو قلعوں کے علاوہ یہاں پر دو اور قلعہ نما ساخت یا بناوٹ پائی جاتی ہیں ایک مغربی دروازہ کے پاس یعنی قلعہ کی دیوار سے متصل ہے اور دوسرا مشرقی دروازہ کے پاس پہاڑی پر چھتری نما ساخت واقع ہے۔ یہ دونوں بناوٹیں وسیع اور مستطیل مینار کی طرح ہیں۔ اور پہلا مینار ''چن۔یاری'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بیرونی قلعہ بندی:

قلعہ کی دیوار دور سے نظر آتی ہے جس کے کچھ حصے پیچیدگی سے پہاڑی کے اوپر

اور وادی کے نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر کوئی سیاح دروازہ کے پاس سے گزرے تو وہ بغور ایک خشک ندی (جو کبھی پانی سے بھری ہوتی تھی) جو درمیان سے دیوار کو جدا کرتی ہے اس کا مشاہدہ کرے گا۔ کچھ جگہوں پر ابھی بھی تھوڑا سا صاف اور مزیدار پانی موجود ہے۔ ندی کے دونوں طرف دو گول نما قلعہ کے برج موجود ہیں جس کی وجہ سے دیوار اوپر اور اندر کی طرف مڑتی ہے۔ خشک ندی کے درمیان میں دو بیضوی ستون ہیں۔ ایک ستون اپنی اصلی جگہ پر جبکہ دوسرے ستون کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہے اور یہ اپنے اصل مقام سے بھی ہٹایا گیا ہیں ان دونوں ستونوں میں سوراخ ہیں۔ ستونوں میں یہ سوراخ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے درمیان بند بنانے کے لیے لکڑی یا دھات کے تختے باندھے گئے تھے۔ تاکہ پانی کو روک کر وادی میں ایک جھیل بنائی جا سکے۔ اس جھیل کے آثار آج بھی وادی میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ستونوں کے اوپر لکڑی کے تختے رکھے گئے تاکہ یہ پل کا کام کر سکیں اور اس پل کی مدد سے ایک شخص قلعہ کے ایک حصے سے دوسری جگہ جا سکے۔ یہ پل ان دونوں گول میناروں کی وجہ سے محفوظ ہے جو ندی کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علاقے کے اطراف میں جو قدرتی (نقوش) ماحول ہیں انہیں بڑی مہارت سے استعمال میں لایا گیا ہے۔ یہ بند اور پل کا نظام شمال مشرقی یا آمری دروازہ کی طرف بھی موجود ہے۔

اس طرف سے قلعے میں داخلہ تقریباً خفیہ ہے کسی بھی شخص کو اندر جانے کے الٹے ہاتھ پر موجود گول نما قلعہ کے برج کے الٹی طرف ایک گول چکر لینا پڑتا ہے۔ قلعے میں داخل ہونے کی یہ جگہ نظر سے چھپی ہوئی ہیں اور ایسے شخص جو کہ اس داخلی دروازے کے بارے میں جانتا نہ ہو اس کے لیے اسے ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پل کے دونوں اطراف دو قلعہ کے برج یا مینار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی مینار ہیں جو ان کے بعد ہیں۔ مستطیل میناروں کو گول میناروں میں تبدیل کر کے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی یا اضافہ فوجی مقاصد کی آسانی کے لیے کی گئی۔ حقیقت میں مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے

یہاں کوئی بھی گول مینار نہیں۔ یہ ایک بہت ہی اہم اور نمایاں بناوٹ ہے اس قلعے کے فن تعمیر کے دور کی تشخیص کے لیے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعد میں تعمیر ہونے والے گول نما قلعہ کے برج پتھر (sand stone) سے بنائے گئے ہیں جبکہ باقی سارے قلعہ کی تعمیر چونے کے پتھر سے کی گئی ہیں۔ قلعہ کے گول نما برج وقفے وقفے کے ساتھ دیوار کے ساتھ ہیں اور یہ کم تعداد میں ہیں جو صرف دروازوں کے قرب و جوار میں یا چھوٹے قلعوں کے کناروں پر یہ برج موجود ہیں جبکہ اصل مینار سب کے سب مستطیل اور دیوار کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ اس گولائی تبدیلی کی وجہ سے قلعہ کی اندرونی داخلی راستے کو دوطرفہ ہونے میں مدد ملی۔ یہ دوطرفہ دروازہ کا نظام مسلمانوں کی ایجاد ہے جو کہ براعظم یورپ میں صلیبی جنگجوؤں نے متعارف کرائی اور انہوں نے یہ خیال شام سے لیا تھا دو طرفہ دروازہ بنانے کی ایک اہم وجہ قلعہ میں داخلے کے لیے ایک اور رکاوٹ کا قیام تھا۔ مستطیل مینار کی وجہ سے صرف ایک ہی داخلہ ہے وہ بھی بالکل سیدھا۔ اگر آپ الٹی طرف سے قلعہ میں داخل ہوں تو آپ دو مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی جگہ دیکھیں گے۔ اس کے ساتھ اور نیچے ایک اور چوکور سوراخ دیوار میں نظر آتا ہے جس سے سلاخ گزار کر دروازہ کی مضبوطی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار ایک وزنی زنجیر گزار کر بھی دروازہ کو مضبوط کیا جاتا ہیں میرے خیال میں زنجیری نظام طور طریقے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک طرف سے سوراخ نسبتاً لمبا ہے جو کہ زنجیر کھینچ کر دروازہ کھولنے کے کام آتا تھا۔ ان دو دروازوں کے درمیان ہے ایک مستطیل کمرہ ہے ساتھ چوکیداروں کے دو کمروں کے ایک فوجی چوکی بھی نظر آتی ہے۔ جیسے ہی آپ دوسرے دروازے سے گزریں گے آپ ایک کھلے علاقے میں داخل ہو جائیں گے جو پل کی طرف جاتا ہے۔

اس کھلے علاقے کے الٹی طرف ایک خاص قسم کا گنبد جو کہ 10x10 فٹ کا کمرہ ہے۔ جس میں اندر آنے کے لیے دروازہ بھی ہے۔ یہ گنبد اور دروازہ کی کمان کا

ڈیزائن بھی ایک خاص قسم کا ہے۔ میرے خیال میں یہ یقیناً سربین اور ساسانیوں کے محل کے ڈیزائن سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تغلق دور کی تعمیر سے بھی ملتا جلتا ہے۔ یہ صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ یہ کس لیے ہوسکتا ہے؟ یقیناً یہ اسلحہ کے لیے بہت ہی چھوٹا ہے۔ لیکن اس زمانے میں تو بارود تھا ہی نہیں۔ کیا یہ کسی کا مزار ہوسکتا ہے جو بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا ہو اور یہاں دفن ہو؟ لیکن یہاں کسی قبر کے آثار بھی موجود نہیں۔ اس کمرے کے چاروں طرف جھروکے بھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ اس شخص کے رہنے کا کمرہ ہے جو پل پر کام کرتا تھا۔ یہ کمرہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس کی بناوٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دورِ تعمیر وہی ہے جو قلعہ کا ہے۔

اگر ہم اس پل جو کہ ندی پر ہے اس کی سیدھی طرف جائیں تو ہم ایک چبوترے سے گزریں گے جو کہ لکڑی کے تختے ستونوں پر رکھ کر پل بنایا گیا ہیں جو یہاں سے قلعے کی سیدھی طرف سے گزرے گا۔ یہ رستہ دوسری طرف دوہری دیوار کی طرف جاتا ہے جس میں دشوار پشتے بھی شامل ہیں۔ یہ دوہری دیوار یہاں سے گزرنے والے کو ابتدائی حفاظت فراہم کرتی ہے۔

قلعہ کی دیوار کی اندرونی جانب ایک فصیل موجود ہے۔ لیکن یہ دوہری دیوار صرف دروازے کے آس پاس تھوڑے فاصلے تک ہی ہے۔ اگر آپ قلعے کی سیدھی طرف سے گزریں جہاں سے آپ فوراً نیچے کو اترتے ہیں وہاں ندی میں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ یہ سیڑھیاں یقیناً ندی میں سے پانی حاصل کرنے کے لیے ہیں تاکہ اس مقصد کے لیے قلعے سے باہر نہ جانا پڑے۔ اس کے بعد دیوار اوپر کی طرف جاتی ہے اور مینار پر جا کر ختم ہوتی ہے، اصل دیوار بغیر کسی اور رکاوٹ کے آگے کی جانب بڑھتی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف تین گول قلعہ کے برج نظر آتے ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے۔ تین برج ہی الٹے ہاتھ کی طرف اور یہ ایک بڑے مستطیل مینار جو کہ پہاڑی کی چوٹی پر ہے وہاں جا کر ختم ہوتے ہیں۔ وادی کے نیچے اس کے بعد

دیوار نظر آنا بند ہو جاتی ہے۔ یہ مستطیل مینار وقفے وقفے سے موجود ہیں جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے۔ کچھ جگہوں پر یہ ضرورت سے زیادہ بڑے اور کچھ جگہوں پر یہ گول قلعہ کے برج میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اصلی دیوار میں کوئی گول مینار نہیں ہیں۔ یہ دیوار تقریباً 30 فٹ اونچی ہے۔ جبکہ اس کی موٹائی میں یکسانیت نہیں ہے۔ قلعہ کے برج کے پاس سے اس کی موٹائی 6 فٹ ہے۔ اور جب یہ قلعہ کے برج سے الگ ہوتی ہے تو اس کی چوڑائی 5 فٹ ہوتی ہے۔ فصیل کی چوڑائی خصوصی طور پر 8 فٹ رکھی گئی اور اس کی موٹائی ملبہ ڈال کر بھری گئی۔ دیوار بالکل سیدھی نہیں ہے بلکہ یہ اندر کی طرف تھوڑی جھکی ہوئی ہے دیوار کی مضبوطی کے لیے۔ پوری دیوار چونے کے پتھر سے بنائی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ دیوار تیراندازوں کے لیے بنائی گئی تھی بعد میں ان سوراخوں کو بڑا کیا تا کہ یہاں تیراندازی ہو سکے اور اسلحہ چلانے میں آسانی ہو سکے۔

یہ دیوار 18 میل پر پھیلی ہوئی ہے اور دنیا کی سب سے بڑی قلعہ بندی ہے۔ اس کے وسط میں دو اور قلعے بھی ہیں۔

قلعہ رنی کوٹ میں مزید قلعے

آیئے نظر ڈالتے ہیں دو چھوٹے قلعوں پر جن میں سے ایک چوٹی پر واقع ہے اور دوسرا اس قلعہ کے بڑے احاطے کے مرکز میں ہیں۔ جو نیچے ہے اس کا نام ''مری قلعہ'' ہے اور اوپر والے کا نام ''شیر گڑھ قلعہ'' ہے۔ ان دونوں قلعوں کا لسانی مطلب مجھے سمجھ نہیں آیا۔ مری اور لکشمر جی مری اصل میں پرانے زمانے کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے محل نما قلعے تھے۔ شاید ان کا نام کسی عظیم شخصیت کے نام پر ہو۔ شیر گڑھ سطح سمندر سے 1480 فٹ بلند ہیں ان دونوں کی پیمائش تقریباً ایک جتنی ہے یعنی تقریباً دونوں اطراف سے 150 گز مری قلعہ تھوڑا سا بڑا ہے۔ یہ تین رہائشی علاقوں میں منقسم ہے۔ جن کی حالت کافی خراب ہیں یہ رہائشی کمرے قلعے کی تعمیر سے یقیناً بہت

بعد میں بنائے گئے۔ حالانکہ الٹے ہاتھ کے ایک کمرے میں کندہ پتھر کے بہت سے نمونے پڑے ہیں جن پر شاندار پھولوں کے نقوش ہیں۔ یہ کندہ ہوئے ٹکڑے قلعے کے دور سے متعلق ہیں۔ کیونکہ اسی طرح کے کندہ نقوش قلعے میں نظر آتے ہیں جنہیں کمانوں اور دیواروں میں لگایا گیا ہے۔ یہ کمرے شاید تالپوروں یا کلہوڑوں نے تعمیر کرائے اور شاید برطانوی حکومت میں فوجی حرکت یا چالوں کے لیے تعمیر کیے گئے۔ اگرچہ جی۔ایم سید کے اس پر یقین نہیں رکھتے کہ یہ قلعہ بھی برطانیوں کے پاس رہا۔ لیکن کنندہ ہوئے نقوش کی بناوٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یقینی طور پر قلعے کے دور کے ہیں اور یہ سیتھو ساسانی نقوش جیسے ہیں۔

ان دونوں چھوٹے قلعوں کی گزرگاہ سن دروازہ کی گزرگاہ جیسی ہے، لیکن اصلی ساخت میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے۔ مری قلعے کی سامنے کی دیوار کے درمیان ایک مستطیل مینار تھا جسے دونوں اطراف سے بڑا کیا گیا ہے اور تھوڑا سا گول بھی کیا گیا ہے۔ بیرونی طرف سے یہ بالکل بھی مستطیل نظر نہیں آتا لیکن جیسے ہی کوئی اس مینار کے اندر داخل ہو تو اس تبدیلی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ سے گزرگاہ کو دوہرے دروازہ کی شکل دی گئی ہے اور یہ سن دروازہ سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس گزرگاہ کے دونوں اطراف دو محراب دار کمانیں ہیں۔ یہ محرابیں بہت خوبصورتی سے کندہ کی گئی ہیں لیکن جس پتھر پر کندہ ہیں وہ ریتلا پتھر ہے۔ جو اس قلعے کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی کماندار محرابیں بھی ہیں جو کہ اس پتھر پر کندہ ہیں۔

دوسرا قلعہ جو کہ کافی اوپر واقع ہے۔ شیر گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہیں نقشے پر اسے سمندر 1480 فٹ اوپر دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک قبرستان بھی موجود ہے۔ اس قلعے کے اندر رہائشی کمرے موجود نہیں۔ یہ قلعہ بالائی اور مغربی دروازے کے قریب ہے۔ مشہور سندھی مصنف، مرزا قلیچ بیگ اس قلعہ کو دیکھنے آیا اس کا نام بھی دیوار پر کندہ ہوا ہے۔ یہ قلعہ مری کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس قلعے کے بھی چاروں

طرف چار گول قلعے کے بُرج ہیں۔ یہ بھی بعد میں تبدیل ہوئے نہیں کیونکہ اصلی مینار مستطیل تھے۔ ان میناروں کو بہت بعد میں گول کیا گیا۔ ان دو قلعوں کی اندرونی دیوار دہری ہے جو کہ بڑے قلعے کی اصل دیوار سے مماثلت نہیں رکھتی۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دوہری بناوٹ یا ساخت صرف دروازوں کے پاس ہی ہے۔ دوہری دیوار کی ساخت دیوار چین سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ مورچے اور نوکدار ڈنڈوں کا مضبوط جنگلا کی تبدیلی بھی بیرونی دیوار جیسی ہے۔

ان قلعوں میں پہلے ہی دو اضافی ساختوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایک مغربی دروازہ کے قریب ہے تقریباً 80 گز یا 100 گز پر۔ اور دوسری مشرقی اور سن دروازے کے قریب دونوں مستطیل ہیں۔ جیسے ہی کوئی مغربی یا بالائی دروازے کے پاس آئے اسے آبشار نظر آتی ہے جہاں سے چھوٹی ندی کا صاف پانی ابھی بھی ٹپک رہا ہے جس نے وادی کے اندر پانی کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ بنا دیا ہے۔ آٹھ ایکڑ پر محیط ایک علاقہ کاشت ہوا بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جگہ سے زمین بہت زرخیز دکھائی دیتی ہیں یہ جگہ مری قلعہ اور مغربی دروازے کے درمیان ہے۔ یہ وادی جگہ جگہ سے مسام دار ہے پانی کئی جگہوں سے رستا نظر آتا ہے اور کچھ جگہوں پر غائب ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی مری قلعے کے پاس آئے تو وہ جنوب مغربی جانب دور لمبی پہاڑی پر ابھرا ہوا قلعہ کا برج دیکھ سکتا ہے، یہ قلعوں کی رسائی کی حد بندی کا ایک اچھا مقام ہے۔ یہ جنوبی یا شاہ پر دروازہ ہے۔ مری قلعہ سے نیچے پوری وادی کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ جو کہ مشرق سے مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کبھی یہ وادی یقیناً بہت خوبصورت نظر آتی ہوگی پرانے وقتوں میں اور یہاں لوگ رہائش پذیر تھے اور بہت ہی اچھے درختوں سے بھری ہوئی ہے۔

دورِ تعمیر

اب ہم آتے ہیں اس بہت بڑی یادگار کے پیچیدہ سوال پر یعنی اس قلعے کا دور

تعمیر بدقسمتی سے ہمارے پاس ایسی معلومات یا تاریخی ثبوت نہیں جس سے اس قلعے کے اصل وقت تعمیر کا پتہ چل سکے اس لیے ہم خود سے ہی اس قلعے کی فن تعمیر پر غور کرتے ہوئے اس کے دورِ تعمیر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہمیں کچھ حقائق ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ مسلمانوں کے ذہن میں قلعے بنانے کا خیال کہاں سے آیا؟ ابتدائی مسلمانوں کی افواج کا کئی رومن قلعوں سے گزر ہوا۔ انہوں نے ان قلعوں کو دیکھا، فتح کیا اور وہاں رہنا شروع کیا اور پھر بعد میں اس کے ڈیزائن کا تبدیل بھی کیا۔ مثال کے طور پر امیہ خلیفوں کے محل۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں داخلی دروازے بالکل سیدھے تھے۔ رومن بازنطینی اور فارسی ادوار میں موڑ کھائی ہوئی گزرگاہوں کی مثالیں نہیں ملتی۔ ان موڑ کھائی ہوئی گزرگاہوں کی تاریخ المنصورہ شہر سے شروع ہوتی ہے۔ اس قلعے کی روایتی خوبیوں کی تعمیر تالپوروں سے ملتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کے نقطہ آغاز کا سہرا کلہوڑوں کے سر باندھتے ہیں۔ ڈاکٹر این اے بلوچ جو کہ سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے لکھتے ہیں۔

''رنی کوٹ قلعے کی ابتداء کے حوالے سے کوئی تفصیلی ریکارڈ موجود نہیں، لیکن تالپور کے نواب خاندان ضلع حیدر آباد کی خاندانی روایات ہمیں ایک اچھا اندازِ فکر دیتی ہیں جو کچھ یوں ہے۔ بیرونی حملوں سے بچنے کے مسئلے نے کلہوڑا حکمرانوں کی توجہ قلعہ یا بلند مقام کی طرف دلوائیں میاں نور محمد نے اس مقصد کے لئے عمر کوٹ کو چنا اور یہاں قلعے کی دوبارہ تعمیر شروع کی اور یہاں توپیں نصب کی جب نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کیا تو میاں نور محمد نے عمر کوٹ تک پسپائی کی مگر نادر شاہ نے عمر کوٹ پر انہیں پکڑ لیا۔ میاں نور محمد جنوب کی طرف مزید نہیں جا سکتے تھے کیونکہ کچھ، کاٹھیہ وار، جودھ پور اور میواڑ تمام ہندو ریاستیں تھیں اور وہاں سے انہیں کسی قسم کی مدد کی امید نہیں تھی میاں نور محمد کے پاس شکست تسلیم کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

''اس مثال سے یہ ثابت ہوا کہ جنوبی سندھ میں قلعے کیا اہمیت تھی اور اسی بات کو

ولی محمد خان لغاری نے تالپور حکمرانوں کی توجہ دلا کر یہ باور کرایا۔ میر کرم علی خان اور میر مراد علی خان دونوں ہی قلعہ کی تعمیر کرانا چاہتے تھے۔ ولی محمد خان لغاری جو کہ خداداد صلاحیتوں کے مالک، ایک انجینئر، ایک اچھے سپہ سالار، طبیب اور ایک بہت بڑے شاعر تھے جب امیروں نے بھروسہ کرتے ہوئے انہیں کام سونپا تو انہوں نے رنی کوٹ کا یہ موجودہ علاقہ ہی چنا۔ رنی کا علاقہ میں تیز دھاری والی پہاڑی کے علاوہ سارا سال بہنے والی ندی اور ایک چھوٹی وادی جس میں یہ ندی بہتی تھی اس وادی کو ایک ایسی لمبی پہاڑی نے گھیرا ہوا ہے جس میں فاصلے پر سوراخ بھی ہیں جنہیں آسانی سے بھر کر ایک قدرتی قلعہ بنایا جا سکتا تھا[58]۔

''ولی محمد خان کی تجویز پر اس قلعہ کی تعمیر شروع کی گئی (بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندرونی چھوٹے قلعے، شیر گڑھ اور مری اور شاہی رہائشگاہ منصوبہ بندی اور تعمیر ولی محمد خان کی نگرانی میں شروع کی گئی۔ صرف ایک کام جو مکمل ہونے سے رہ گیا وہ رنی کوٹ پر دروازے نصب کرنے کا تھا۔ یہ کے نیچے دروازوں کی تشکیل میں لوہے کی سلاخیں استعمال کی گئی لیکن بارش کے موسم میں پانی کی شدت سے یہ سلاخیں مڑ گئی اور دروازوں نے صحیح کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی محمد خان کو لاڑکانہ کا نواب بنا دیا گیا تھا اور ان کی غیر موجودگی میں یہ کام صحیح طور پر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مناسب دروازے نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ کو غیر محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔

''میر حسن علی خان تالپور (1324/1909ء) سندھی مثنوی ''فتح نامہ'' میں رنی کوٹ کی ابتدا کو میر کرم علی خان (1227/1244ء) اور ساتھ ہی میر مراد علی خان کا شاندار کارنامہ بتاتے ہوئے اس کے چند نقوش کا ذکر کرتے ہیں۔ رنی کوٹ ہمارے آباؤ اجداد کا چھوڑا ہوا ایک اہم کارنامہ جب یہاں نلسازوں نے کام کیا تو انہوں نے ان پہاڑیوں کی بنیادوں سے لے کر چوٹی تک کے تمام سوراخوں کو بھر دیا تا کہ یہ ایک قدرتی لمبی پہاڑی کے سلسلہ طور پر کام آ سکیں۔ اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ ایک دیوار

بنائی گئی جو کہ ایک اور پہاڑی سلسلہ سا بن گیا قدرتی پہاڑی سلسلے کے ساتھ یہ ساری دیوار پتھر سے بنائی گئی جو کہ میلوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ سینکڑوں قلعوں کے پشتے کھڑے کیے گئے۔ اور اس کو ہزاروں بڑے اور بے شمار چھوٹے چبوتروں سے سجایا گیا۔ ایک اور قلعہ بندی ''شیر گڑھ'' بھی اس کے اندر تعمیر کی گئی۔ چار قلعے کے برج شیر گڑھ کی دیوار کے ساتھ کھڑے کیے گئے اور ایک اور مضبوط قلعہ مری بھی چار قلعوں کے برجوں کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔

''قلعے کے درمیان سے تیز دھاری والی پہاڑیاں گزرتی ہیں۔ جب بارش نہ ہو تو قلعہ کے اندر تو پانی موجود ہے پر باہر پانی کا ایک بھی قطرہ نہیں ہوتا۔ قلعے کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے دروازے بہت ضروری تھے۔۔ انہوں نے دو دروازوں کی منصوبہ بندی کی ایک مغرب اور ایک مشرق کی طرف نیچے۔ پہلے انہوں نے مضبوط ستون کھڑے کیے اور پھر دروازے نصب کیے گئے۔ یہ مضبوط سلاخوں کے ساتھ لوہے کے دروازے تھے۔ ان میں ہزاروں من لوہا استعمال ہوا پر ان دروازوں نے کام نہ کیا۔ بارش کے موسم اس علاقے میں ہفتوں مسلسل پانی بہتا ہے اور پانی کی شدت کی وجہ سے یہ سلاخیں رسی کی طرح مڑ جاتی ہیں۔ چونکہ قلعے کے دروازے صحیح طور پر کام نہ کر سکے اس وجہ سے یہ قلعہ ناقابل تسخیر نہ بن سکا۔ اس قلعہ کو مکمل کرنے میں سترہ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔''

اب ہم ایک اور بیان پیش کرتے ہیں جو کہ سندھ گزیٹر سے لیا گیا ہے۔ جسے A.W. Huges نے 1876ء میں مرتب کیا۔ اس سے اس قلعہ کی تاریخ کو جاننے میں مزید مدد ملے گی[59]۔ یہ کچھ اس طرح ہے: ''اس جگہ (سن) کے جنوب مغرب میں ایک وسیع مگر تباہ حال قلعہ رنی کا کوٹ ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے ابتدائی حصے میں اسے دو میر تالپوروں نے تعمیر کروایا۔ اس قلعہ کی تعمیر کا مقصد نہ صرف خزانے کے ذخائر کے لئے ایک محفوظ جگہ فراہم کرنا تھا بلکہ ساتھ ہی حملے کے

وقت اپنے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کا قیام بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کی تعمیر میں بارہ لاکھ روپے خرچ ہوئے لیکن سن دریا ایک زمانے قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی بہتا تھا بعد میں اس نے اپنا رخ موڑ لیا جس کی وجہ سے اس علاقے میں پانی کی قلت پیدا ہوگئی۔ نتیجتاً یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی۔ سن ندی اب قلعے کے اندر سے گزرتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اب کہیں بھی پانی کی قلت نہیں رہی۔''

''رنی کا کوٹ کی تعمیر 1812ء میں 12 لاکھ روپے میں میر کرم علی تالپور اور ان کے بھائی میر مراد علی نے کرائی۔ اس علاقے میں پانی کی کمی کی وجہ سے یہ جگہ کبھی بھی رہنے کے قابل نہیں رہی۔ بارشوں میں ایک تیز ندی اس میں سے گزرتی تھی اور دریائے سندھ سے جا ملتی تھی۔ اس کے بہاؤ کی وجہ سے قلعہ کی دیوار کا کچھ حصہ بھی تباہ ہوا۔ اس قلعے کی تعمیر کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ جنگ کے دنوں میں میروں کو ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کرنا۔ دریا جو کہ سن دریا ہی ہوسکتا ہے جو شمال کی طرف گزرتا تھا لیکن 1827ء میں اس کے بہاؤ نے رخ تبدیل کیا جس سے قلعہ کی شمال مغربی دیوار کا کچھ حصہ متاثر ہوا یہاں Huges مزید اضافہ کرتے ہیں کہ ''موجودہ سن دریا اور جیسا اسے رنی نئی بھی کہا جاتا ہے قلعہ کے اندر سے گزرتا ہے۔'' یہ بھی ممکن ہے کہ قلعہ کا یہ نام یعنی کہ رنی کوٹ اس ندی Rani Nai کے نام پر رکھا گیا ہو۔

اس قلعے کی تفصیل جو کہ زیادہ ترصحیح ہے، ایک طرف رکھتے ہوئے کرنل رشید لکھتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ تالپوروں کے اس قلعے کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو وہ اتنے امیر تھے اور نہ ہی ان کے پاس اتنے وسائل کہ وہ اتنی بڑی تعمیر کر سکتے۔ یہ حکمران جاگیردارانہ نظام کی باقیات تھیں ان کی زمین بھی تقسیم تھی جاگیروں میں چند سرداروں کے زیر سایہ جو بدلے میں ضرورت کے وقت فوجی مہیا کرتے تھے ان کے پاس کوئی منظم یا بڑی فوج نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ 50 ہزار آدمی اکٹھے کر سکتے تھے۔ جہاں تک ان کے پیسے یا مال و دولت کا تعلق ہے، ان کی آمدنی کا تعلق زمینداری نظام سے

رہا جو مشکل سے 35 لاکھ روپے سالانہ بنتی تھی۔ اس قلعہ کی تعمیر پر جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ کل خرچہ 12 لاکھ ہوا۔ لیکن اس قلعے کو دیکھنے کے بعد یہ تصور کرنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے کہ یہ معمولی رقم اتنے بڑے قلعہ کی تعمیر کے لیے کافی تھی۔ میرے اپنے قیاس کے مطابق اس قلعے کی تعمیر پر 2 کروڑ سے کم خرچ نہیں ہوئے اور یقیناً ہزاروں لوگوں نے سالوں تک اس کو مکمل کرنے پر کام کیا۔ اور تالپوروں کا پیسہ اور وسائل دونوں اس خرچے کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ میرے لیے یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر 1812ء میں ہوئی۔ یقیناً اس وقت اس کی مرمت یا اس میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہوں گی لیکن چند وجوہات کی بنا پر یہ قلعہ یقینی طور پر بہت بڑا تعمیر ہوا۔ جو درج ذیل ہیں:

1- بل کھاتی ہوئی بیرونی دیوار مستطیل میناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے جس کا 10ویں صدی کے عیسائی دور میں رواج تھا۔

2- مشرقی دروازہ کا نام آمری دروازہ ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آمری دور اس وقت پھیل رہا تھا جب قلعہ کی تعمیر ہوئی اور آخری صدی میں یہ ختم نہیں ہوا تھا۔

3- مری قلعہ میں کندہ ہوئے نقوش ٹھٹھہ فنکاروں کے ہیں۔

4- گنبد نما ساخت جو کہ سن دروازہ کی گزرگاہ کے اندر کی طرف ہے۔ Sythio-Sassanian سے تعلق رکھتی ہے۔

5- دیوارِ چین اور رنی کوٹ کے درمیان بہت زیادہ مماثلث موجود ہے جو اس طرف اشارہ کرتی کہ اس قلعہ کی تعمیر کا دور بہت پرانا ہے۔

تالپوروں اور میروں نے بھی شاید ضرورت کے وقت پناہ گاہ کے طور پر بھی اس قلعہ کو رہائشی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ایک اور اہم حقیقت جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تالپوروں اور کلہوڑوں نے جو قلعے تعمیر کیے وہ ہمیں دریائے سندھ

کے مشرق کی طرف ملتے ہیں نہ کہ مغرب کی جانب۔ جو تبدیلیاں اور مرمت اس قلعے میں انہوں نے کرائی وہ بھی اس وقت کرائی جب ان کے ریاست قلات کے ساتھ اختلافات تھے۔ لیکن حقیقتاً قلعہ کی تعمیر اس سے بہت پہلے ہوئی[60]۔

کرنل رشید کے مطابق اس قلعے کی تعمیر کی ضرورت ان لوگوں کو محسوس ہوئی جو کہ موجودہ قلعہ کے اندر زرخیز وادی میں رہتے تھے۔ دراصل اس وادی میں لوگوں کی رہائش بہت ہی پرانی ہے اور چونکہ یہ وادی بہت زرخیز تھی اس لیے بہت زیادہ کشش بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے تاریخ میں کسی وقت ان حکمرانوں نے جو یہاں مستقل طور پر رہائش پذیر تھے اس جگہ کو محفوظ بنانے کے لیے قلعہ کی تعمیر کی اس وادی کے مرکز میں چھوٹے قلعے بھی ہیں جن کا مقصد جنگی چالوں کے لیے بوقت ضرورت استعمال ہے۔ اور یہ چھوٹے قلعے دوسرے اور تیسرے درجے کی دفاعی لائن کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے حملے کے وقت، جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر کے لیے علاقے سے باہر سے لوگ بلوانا خاص طور پر ان کو غذا مہیا کرنے کے حوالے سے اور کافی مشکل تھا یقیناً قیدیوں اور کچھ ماہر فنکاروں نے بھی اس قلعہ کی تعمیر میں مدد کی ہے۔

اوپری قلعہ یعنی شیر گڑھ کے نیچے کی جانب رہائش کے کئی اشارے شواہد موجود ہیں یہ ایک بہت بڑے قبرستان کی شکل میں ہیں۔ کچھ قبریں پتھر کے گنبد کے ساتھ اور پتھر کے تابوت اور کچھ عام سی قبریں ہیں۔ اس میں بالکل کوئی شک نہیں کہ اس وادی میں لوگ رہے تھے۔ حالانکہ آج یہاں رہائش کے آثار کے سراغ نہیں ملتے اور شاید ان کے مکانات تیز بارشوں کی وجہ سے بہہ گئے ہوں گے۔ شاید یہاں ہونے والی مزید کھدائیاں یہ ظاہر کر دیں کہ یہاں لوگوں کی رہائش تھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ وادی Captian Delhoste اور Huges کے دور سے بہت پہلے ویران ہو گئی تھی اور شاید یہ سب کچھ تالپوروں اور کلہوڑوں کے وقت سے بھی پہلے ہوا ہو۔ اس پورے واقعے کو تصور میں رکھنے سے ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تاریخ میں بہت پہلے سن اور

آمری دروازوں پر موجود پل سیلاب یا تیز بارشوں کی وجہ سے یا کسی فوجی حملے کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وادی کا پانی باہر چلا گیا اور یہ علاقہ خشک ہو گیا۔ اور آبادی اس علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اس جگہ جو پانی کی ندی آج بھی موجود ہے ظاہر کرتی ہے کہ صاف پانی کی یہ ندی مغربی دروازے کے قریب چھوٹے آبشار سے نکلتی ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ ندی بڑی تھی۔ پانی کے تیز بہاؤ اور پل کے نیچے جو بند ہے اس کی وجہ سے پانی کی بہت بڑی مقدار جھیل میں اکٹھی ہوتی ہے۔ اور جب یہ پانی اس جھیل سے نکلتا ہے تو اور بارش کی وجہ سے زمین کا کچھ حصہ بہہ جاتا ہے اور اس پوری وادی کو بنجر کر دیتا ہے اور نیچے صرف کمزور زمین رہ جاتی ہے جو کہ پتھروں سے بھری ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے یہاں کچھ نہیں اگتا سوائے صحرائی نباتات کے۔

اب آتے ہیں اصل سوال کی جانب۔ اس قلعہ کی تعمیر کس نے کی؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بالکل ٹھیک فیصلہ تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ لیکن بہت ساری ممکنات میرے ذہن میں آتی ہیں۔ جہاں تک قلعہ کے آثار کی بات ہے میں نے اوپر کئی دلیلیں دی ہیں۔ اس قلعے کے دور تعمیر کا صحیح وقت تعین کرنے کے لئے تاریخ کے مختلف ادوار کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا ہوگا۔ آیئے ان ادوار کا اولیت کے حساب سے جائزہ لیتے ہیں اور ہر دور کے قابل عمل ہونے پر بحث کرتے ہیں یہ ادوار کچھ اس طرح ہیں[61]:

1-	British	1857-1947	2-	Talpurs	1783-1857
3-	Kalhoras	1700-1783	4-	Moghuls	1500-1700
5-	Tarkhans	1450-1550	6-	Arghunn	1350-1450
7-	Sumas	1325-1350	8-	Tughlaqs	1310-1325
9-	Sumras	1225-1310	10	Tartars	1000-1225
11-	Scythians	200-100 BC	12-	Parthian	100-50 BC
13-	Sassanians	325-50 BC	14-	Greeks	325 BC

اس فہرست میں سے پہلے دو ادوار کے امکانات کو پہلے ہی ختم کر چکا ہوں۔ برطانیوں کا ذکر نہیں کیا پر انہیں بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اس براعظم میں کسی قلعے کی تعمیر نہیں کی۔ مغلوں کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ بالکل بھی مغلیہ فن تعمیر نہیں۔ اس میں مغلوں کی کوئی خصوصیات موجود نہیں۔ ترخان، ارغون اور سومرے دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے چھوٹے جاگیردار تھے۔ جنہوں نے صرف ٹھٹھہ کے قریب تعمیرات کیں اور تاتاریوں تک سب یہاں کچھ عرصے کے لیے آئے وہ بھی سفر کی حد تک۔ فیروز شاہ تغلق یہاں کئی دفعہ آیا اور یہاں ایک جھیل سانگڑ کی تعمیر بھی کروائی۔ وہ یہاں اپنے وقت کے مشہور بزرگ پیر لال شہباز کے پاس آتے تھے۔ رنی کوٹ کے قلعے کا فن تعمیر تغلق فن تعمیر سے کچھ مماثلث رکھتا دکھائی دیتا ہے اور جو پرانے قلعے انڈیا میں تعمیر ہوئے۔ ہندوؤں کے امکانات کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ابتدائی مسلم دنوں میں وہ قلعہ کی عمارت سے ناواقف تھے۔

جہاں تک ستھین کی بات ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ حملہ آور نہ تھے بلکہ وہ رہائش کے لیے آئے تھے۔ ان کی شاخ یا قبیلہ سندھ کے جنوب سے شمال کی طرف دریائے سندھ کے ساتھ آباد ہونے آئی اور یہ تاریخ میں Indo Scythians کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ Scythians وسطی ایشیا سے آئے اور یہ آریاؤں کی شاخ تھے۔ یہ ممکنات میں سے ہے کہ وہ اپنے ساتھ دیوار چین کی معلومات بھی لائے جو کہ بہت سے حوالوں سے اس عظیم قلعہ رنی کوٹ سے مماثلت رکھتی ہیں Scythio-Parthian کے آثار بھنبور سے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ بیرونی قلعہ بندی متوازی قطاروں میں خالی چھوڑی گئی ہے یعنی ایک کے اوپر ایک۔ دیوار یکے بعد دیگرے گول اور مستطیل میناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ابتدائی مسلم دور کی تعمیر ہے مگر محمد بن قاسم کے حملے کے وقت مسلمان کسی بھی دفاعی فن تعمیر سے ناواقف تھے۔ انہیں اس کا پتہ اس وقت چلا جب صلیبی عراق اور شام کی

سرحدوں پر دشمنوں کے آمنے سامنے تھے اور رومن قلعے وہاں موجود تھے۔ بھنبھور قلعہ بالکل رنی کوٹ کے قلعے کی طرح Scythian ساخت کا آج بھی سندھ کی آبادی کا زیادہ تر حصہ Scythian ہے اور باقی سارے Semetic ہیں۔

یونانیوں کے امکان کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ یہاں بہت تھوڑے عرصے کے لیے رہے سکندر بھی 4 سال سے زیادہ عرصے برصغیر میں نہیں رہا۔ اس کے پاس تعمیراتی کاموں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ ایک حملہ آور تھا جو فتح کے بعد اپنی فوج کے ساتھ جلدی سے واپس چلا جاتا تھا۔

ٹیلہ آمری:

یہ ٹیلہ زمانہ ماقبل از تاریخ سے متعلق ہے۔ 1929ء میں ایف سی مجمدار نے اسے دریافت کیا یہ Cahlcolithic بود و باش کے آثار کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے یہاں پر کھدائیوں کا سلسلہ تین ٹیلوں سے شروع ہوا جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آثار تاریخی تواتر قائم کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئے فرانسیسی آرکیالوجیکل مشن اور پاکستان آرکیالوجی نے یہاں 62-1959ء تک کھدائیاں کیں اس مقصد کے لئے تین ٹیلوں کی کھدائی اصل زمین تک کی گئی ہر ایک سے ملنے والے خصوصی برتن اور ٹھیکریوں کی وجہ سے تاریخ مرتب کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئے سب سے اوپر والے حصہ میں چمکدار ظروف ٹھٹھہ اور ملتان طرز کے ملے اور مغلوں کے چند سکے بھی ملے مسلم آبادی کے نیچے تیسری صدی قبل مسیح کے آثار میں ٹھیکریوں کی موٹائی ہڑپہ اور موئن جو ڈرو سے ملنے والے میٹریل کی طرح ہے نیچے تک کھدائی کے دوران یہاں سے بھٹیاں ملتی ہیں۔ مٹی کے برتنوں پر ہندسی اشکال اور دوسرے نشانات موجود ہیں جو سرخی مائل براؤن ہیں اور چاکلیٹ رنگ بھی ان پر نمایاں ہیں اور یہی آمری سے ملنے والے برتنوں کی پہچان ہے اسی طرح کے برتن بلوچستان اور ایران سے بھی ملتے ہیں عمومی طور پر ہم یہ

کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک نئے انداز کی قدیم ظروف سازی ہے۔ جو آمری کی پہچان ہے ان ظروف پر نشانات سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے لوگ منظم متوازن زندگی گزارتے تھے ان کے برتنوں پر جانوروں کی شبیہہ اور مٹی کی مورتیاں اس خیال کو مکمل طور پر رد کرتے ہیں کہ یہاں مٹی کی مورتیاں موجود نہیں اس سے بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق کوٹ ڈیجی دور سے ہے اور یہ دونوں ہڑپہ کے دور کے خطوط پر ہیں[62]۔

ٹیلوں کا سلسلہ دھمراؤ جوڈرو:

اس کا رقبہ 17.24 ایکڑ ہے۔ گاؤں دھمراؤ کے شمال مغرب میں اور باڈہ ریلوے اسٹیشن سے 6 میل باڈہ میٹر کی روڈ پر ضلع لاڑکانہ میں ہے یہ تین ٹیلے ہیں[63] اور تجاوزات کی زد میں ہیں۔ یہاں سے ملنے والی چیزیں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کی عکاس ہیں[64]۔

ٹیلہ مول جی ماڑی

دیہہ ماتھیلو نرد باتھیلو ٹاؤن تعلقہ ضلع گھوٹکی

تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اپنی تصنیف میں مول اور میندھرا کا قصہ لکھا ہے[65]۔ کہ گوجر بادشاہوں کی اولاد میں سے مول نامی ایک عورت اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنے ملک پر حکومت کرتی تھی اس نے شہر کے کنارہ پر ایک شاندار محل بنوایا۔ جس کے باہر جادو کے زور سے ایک طلسمی دریا اور اس کے گھاٹ پر محل میں داخلے کے لئے پتھر کا دروازہ تعمیر کرایا اور اس پر پتھر کے دو خوفناک شیر استیادہ کرا کے محل کے اندر ایک کمرہ میں سات پلنگ بچھا دیئے جن پر ایک جیسے شیر لگے تھے ان میں سے چھ پلنگ کچے دھاگے کے بنے ہوئے تھے اور ہر ایک کے نیچے گہرا گڑھا تھا اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ جو شخص بھی اس دریا اور شیر کے طلسم سے گزر کر اپنی دانائی کی بنا پر آ کر صحیح پلنگ پر بیٹھ جائے گا اسے میں اپنا شوہر قبول کروں گی اس خواہش

کی جھینٹ کتنے ہی لوگ چڑھے ان میں ایک ھمیر سومرو اپنے تین وزیروں کے ساتھ جن میں اس کا برادر نسبتی (سالا) اور وزیر رانا مینڈھرا، بھی شامل تھا شکار کے دوران اسے ایک سیلانی جوگی ملا جس نے مومل کے حسن کی تعریف کر کے اسے اس کے دیدار کا شوق دلایا۔ ھمیر سومرو بے اختیار اپنے تینوں رفقا کو ساتھ لے کر اس طرف روانہ ہوا اور مومل کے محل کے نیچے ٹھہر گیا خبر ملنے پر مومل نے ایک ہوشیار کنیز کو بھیجا تا کہ ان کے سردار کو دعوت دے اور ساتھ لے آئے چنانچہ پہلے ھمیر اس کنیز کے ساتھ گیا لیکن راہ میں کنیز اسے دھوکہ دے کر وہاں سے نکل گئی اور وہ موجیں مارتا ہوا طلسمی دریا دیکھ کر مقصد حاصل کیے بغیر واپس آ گیا اور شرم کی وجہ سے کسی سے کچھ نہ کہا دوسری رات کنیز آ کر دوسرے کو لے گئی وہ بھی اسی طرح واپس آ گیا چوتھی شب رانا مینڈھرا کنیز کے ساتھ روانہ ہوا وہ حسب دستور آگے آگے چلنے لگی لیکن اس نے اس کا دامن پکڑ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا کہ کنیزوں کو سرداروں کے آگے چلنا زیب نہیں دیتا اس کے بعد وہ طلسمی دریا کے قریب پہنچ کر ششدر رہ گیا بالآخر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانے کے لئے اس نے نیزہ کو جو اس کے ہاتھ میں تھا پانی میں ڈالا تو پتہ چلا کہ اس دریا کی کوئی حقیقت نہیں چنانچہ وہ اس میں سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اس کے بعد اس کی نظر دروازہ کے شیروں پر پڑی تو انہیں بھی اس نے نیزے کے چوکے دے کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی نمائشی ہیں تو وہ کامیابی کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا جہاں ایک جیسے سات پلنگ پڑے تھے جنھیں دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ بیٹھنے کے لئے تو بہر حال ایک ہی پلنگ ہوگا مبادا ان میں بھی کوئی فریب ہو یہ سوچ کر وہ ایک ایک کو نیزے کی نوک چبھوتا ہوا صحیح پلنگ پر براجمان ہوا کنیز نے اس کی ہمت اور عقلمندی کا حال جا کر مومل سے بیان کیا وہ فی الفور باہر آئی اور نکاح کی طلب ہوئی۔ صبح کے وقت وہ ھمیر سومرو اور دوسروں کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان سے حالات بیان کیے یہ سن کر ھمیر نے کہا کہ اب تو وہ خاص تیری ہو چکی تو تجھے لازم ہے کہ اسے ایک بار دیکھنے کی ہمیں دعوت دے۔ دوسری شب مینڈھرا ھمیر

کو چرواہے کے لباس میں اپنے ساتھ لے گیا اسی بے ادبی کی وجہ سے رانا مینڈھرا اس سے کچھ ناراض ہو کر ھمیر نے اسے اپنے ساتھ شہر میں واپس لانے کے بعد نظر بند کر دیا۔

مینڈھرا چونکہ مومل کو دل نذر کر چکا تھا اس لئے اس نے کسی طرح چوکیداروں کو ساتھ ملا کر پھر چوری چھپے ایک برق رفتار اونٹ پر جو ایک رات میں پانچ دن کی آمد و رفت کی حالت طے کرتا تھا سوار ہو کر اپنے محبوب کا دیدار کر کے واپس آ جایا کرتا۔ اتفاقاً ایک شب مومل اپنی بہن سے ملاقات کے لئے گئی تھی کہ مینڈھرا جا کر واپس آیا اور شک میں مبتلا ہو کر غصہ میں اس نے آئندہ جانا ترک کر دیا بے گناہ مومل مینڈھرا کی اس خفگی سے بے تاب ہوگئی اور اپنا ملک چھوڑ کر مینڈھرا کے شہر آ پہنچی پھر اس کے محل کے سامنے اپنا محل بنوا کر اس کی کھڑکیاں مینڈھرا کے محل کی کھڑکیوں کے سامنے رکھوائیں تا کہ اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے لیکن غصہ کی وجہ سے مینڈھرا نے اپنی طرف کی ساری کھڑکیاں بند کرا دیں اس پر مومل نے دوسری طرف حویلی بنوائی اس کی کھڑکیاں بھی اس کے سامنے رکھوائیں غرض اس طرح اس نے مینڈھرا کے محل کے چاروں اطراف اپنی حویلیاں بنوائیں لیکن دیدار سے نامراد رہی تو ایک درد بھری آہ کے ساتھ ناکامی کی حالت میں دار فانی سے رحلت کر گئی جب اس خبر کا مینڈھرا کو پتہ چلا تو وہ بھی ایک چیخ مار کے مر گیا۔ یہ داستان سندھی ابیات میں مشہور سر میں گاتے ہیں۔ اور صاحبان حال اس ..... سے حقیقت کا سراغ پا کر اپنے جذبے اور شوق میں تپش پیدا کرتے ہیں ملا مقیم نامی ایک شخص نے یہ قصہ فارسی میں نظم کر کے اس کا نام ترنم عشق رکھا ممال جی ماڑی گاؤں ما تھیلو گھوٹکی سے 8 میل جنوب مغربی سمت ماتھیلو ایک قدیم گاؤں جو ایک 15 ایکڑ کے اونچے ٹیلے پر آباد ہے جبکہ اس میں 12 ایکڑ پر گاؤں آباد ہے جیسا کہ بقایا تین ایکڑ جنوب مغربی کونے میں ہے۔ یہ ٹیلہ مومل کی کئی منزلہ عمارت پر مشتمل ہے، اور زمین سے کم از کم 50 فٹ اونچا ہے۔ مقامی لوگ وہاں پر تجاوزات قائم کر رہے ہیں یہ ہندو تعمیر ہے یہاں سے حاصل شدہ ٹھیکریوں میں چمکدار اور سادہ برتنوں کی ٹھیکریاں ملتی

ہیں[66]۔اس طرح کی آبادیوں کے گرداگرد چاردیواری ہوتی تھی۔

لکھن جوڑرو2007ء

سکھر شہر میں موئن جوڈرو سے قبل کی سائٹ ہے اگرچہ ہڑپہ اور موئن جوڈارو وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بڑے شہر ہیں مگر اس کے آثار ہمیں ہندوستان اور افغانستان کے بعض علاقوں سے بھی ملتے ہیں بلکہ امریکن آرکیالوجسٹ جوناتھن مارک کنائر کے مطابق اس کے کچھ علاقے ایران اور ترکمانستان میں بھی ملتے ہیں محققین کے مطابق ایسی 1500 بستیوں کے آثار ملتے ہیں جن میں لکھن جوڈرو بھی ہے یہ سکھر شہر سے شمال مشرق کی طرف شکارپور روڈ پر واقع ہے لکھن جوڈرو پہلے پہل 1970ء میں حادثاتی طور پر دریافت ہوا۔ آج خیرپور یونیورسٹی کے ماہرین آثار قدیمہ اس کی کھدائی کرر ہے ہیں اور یہ جگہ تجاوزات کی زد میں ہے[67]۔

قلعہ بھکر

سکھر اور روہڑی کے درمیان دریائے سندھ میں ایک چھوٹا جزیرہ ہے جس میں ایک قلعہ اور اس کی چاردیواری ہے اس چاردیواری کے گردونواح میں دریائے سندھ کا پانی موجود ہے۔قلعہ آج کل پاک فوج کے پاس ہے اور مخدوش حالت میں ہے۔

روہڑی اور سکھر کے درمیان دریائے سندھ میں جزیرہ ہے جسے بھکر، سدرہابیلہ اوردین بیلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بھکر سے آگے اور روہڑی کے بالمقابل ایک جزیرہ ہے جسے خواجہ خضر کا نام دیا گیا ہے اور یہ بکھر میں سب سے بڑا جزیرہ ہے جو بیضوی شکل میں 800 گز مشرق سے مغرب کی جانب اور 300 گز وسیع اور 25 فٹ اونچا ہے دریائے سندھ کی شمالی شاخ اسے سکھر سے علیحدہ کرتی ہے جس میں 100 سے 200 گز کا فاصلہ مختلف جگہوں سے ہے دریا کی کل چوڑائی سکھر اور روہڑی کے درمیان بشمول اس جزیرہ کے 800 سے 900 گز ہے۔ اور اسی جزیرہ پر ایک قلعہ ہے جس

کے اردگرد دریائے سندھ کا پانی ہے جس کی لہریں اس قلعہ کے قدموں کو چھو رہی ہیں۔ اس کے برج جو نیم گول اور نامکمل ہیں دور سے نظر آتے ہیں اس قلعہ کے مختلف سائز کے دروازے بھی ہیں جو اب روڑہ مٹی سے بند ہیں ریلوے لائن اس جزیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ جزیرہ کبھی سلطنت دھلی کے ماتحت تھا ناصرالدین جناچہ جس نے التمش کے دور میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا اور اُچ کا حکمران بنا تھا۔ جسے التمش نے جب اچ سے بے دخل کیا۔ اس نے 1228ء چڑھائی کی تو قباچہ نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی (منہاج سراج 84-1985) جب فیروز تغلق سلطنت دھلی پر متمکن ہوا دھلی سے واپسی پر اپنے سفر کے دوران اس نے خانقاہ بکھر کا دورہ بھی کیا پھر 1365ء میں جب بادشاہ سومرہ حکمرانوں کے خلاف سندھ آیا تب اس نے بکھر کا دورہ بھی کیا اور یہاں اس نے شمس عفیف کی سرکردگی میں 1000 کشتیوں کا بیڑہ (آغا مہدی) 1336ء علاء الدین جام بن بھنبھنا (53-1352ء-67-1366ء) سومرا حکمران نے بکھر پر قبضہ کر لیا جس سے سلطان علاء الدین خلجی نے (1316ء-1296ء) میں واپس لے لیا (قائنی 100:1971) نظام الدین الیاس (1508ء-1416ء) کے عہد میں دوبارہ سومروں کا قبضہ ہو گیا[68]۔

بھکر قلعہ تاریخ کے اوراق میں ارغون خاندان کی حکومت 1520ء سے آتا ہے۔ تاریخ معصومی کے مطابق شاہ بیگ ارغون نے قلعہ کا معائنہ کیا اس نے قلعہ کے گھر اپنے امراء اور سپاھیوں کو دیئے اس نے قلعہ کا سروے کر کے اپنے امراء میں بانٹ دیا جنہوں نے اسے آہستہ آہستہ تعمیر کیا الور کا چھوٹا قلعہ جو عربوں کے زمانہ میں حکومتی چوکی تھا ختم کر دیا گیا اور اس کی پکی اینٹیں بکھر لائین گئیں ترکوں اور سموں نے یہ مٹیریل لے کر قلعہ کی تعمیر میں لگا دیا[69]۔

قلعہ بہت تھوڑی مدت میں بن کر تیار ہو گیا شاہ بیگ نے اپنے بیٹے مرزا شاہ حسین کے ہمراہ اسی جگہ ٹھہرنے کا قصد کیا۔ ہمایوں نے جب 1541ء میں سندھ کا سفر

کیا تو اس نے بھکر پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور اس صورتحال کو سلطان محمود خان نے سنبھالا سلطان محمد خان نے بھکر قلعہ پر قبضہ کر لیا ان دنوں بھکر قلعہ کی دوہری چار دیواری تھی اور بیرونی چہار دیواری کے ۴ دروازے تھے اور 70 بروج اور اس قلعہ کا محیط اس وقت 1875ء گز تھا۔ (صدیقی 1972-36-235) شہنشاہ اکبر نے بھکر کو الگ سرکار قرار دیا جب سلطان محمود نے اپنی وفات سے قبل اپنی بیٹی کی شادی اکبر سے کی (1556-1605) اور بعد میں اپنے علاقے سے پیچھے ہٹ گیا یہ علاقہ پنجند کے بیرونی محال سرکار ملتان کے ماتحت تھی (ایم سلیم اختر 1990-266) جب شاہ جہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگیں ہوئیں اور داراشکوہ نے بھکر کا رخ کیا مگر یہاں بھی اسے پناہ نہ ملی مغلوں کے زوال کے بعد بھکر کلہوڑوں اور تالپوروں کے زیر تصرف آ گیا انگریزوں نے ان سے 24 دسمبر 1838ء کے سمجھوتہ کے تحت لے لیا اور اسے وکٹوریہ کا نام دیا جو مشہور عام نہ ہو سکا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھکر کا نام تحفۃ الکرام (383-1971) کے مطابق یہ قصبہ ھندو راجوں مہاراجوں کے زمانہ میں نہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ میں تھا چچ نامہ کے مطابق Baghrar Fort بگہرور قلعہ کا ذکر موجود ہے جب محمد بن قاسم نے شمال کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو یہ جنوب کی طرف گھوما جہاں جیکب آباد، شکار پور اور سکھر تھا یہاں تک کہ وہ قلعہ بگہرور پہنچ گیا اس وقت یہ قلعہ راجہ داہر کی سلطنت کا حصہ تھا۔ اور اروڑ کے ماتحت تھا ڈاکٹر این اے بلوچ کے مطابق بگہرور قلعہ ہی دراصل یہی بھکر قلعہ تھا جو آج کل دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر ہے۔

تاریخ سندھ کے مطابق کی تاریخ عربوں کے زمانہ تک جاتی ہے اس کی تاریخ بالا حصار سے نکلتی ہے جو 333AH/944-45 تاریخ میں یہ حوالہ موجود ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں اس قلعہ کو دوبارہ بنایا گیا اور اسے فرشتہ کا نام دیا مرزا قلیچ بیگ کے مطابق فرشتہ کا نام شیخ ابوتراب نے 171ھ/ 787ء کے نام پر رکھا گیا (قلیچ

بیگ 1999:9) تحفۃ الکرام کا بیان اس قلعہ کا نام بھکر تھا نہ کہ فرشتہ بلکہ فرشتہ سید محمد مکی کو کہا گیا جو یمن کا باشندہ تھا اور سندھ میں 644ھ/ 47-1246ء میں آئے۔ یہ مشہور روایات ہے کہ سید محمد مکی جب وہ یہاں آئے جو انہوں نے جو محسوس کیا۔ وہ بیان کیا جعل اللہ بکوتی فی بقعہ المبارکہ۔ یہ جگہ بکو تھا جو بعد میں بھکر بن گیا (قانع 1971;386-383)

سلطنت دور میں ہم یہ نام بھکر کے طور پر جانتے ہیں 13ویں صدی کے پہلے نصف میں بھکر کا نام آتا ہے۔ یہ جگہ تو اس سے پہلے بھی موجود تھی مگر غیر اہم تھی۔ سلطان محمود عربوں نے جب ملتان فتح کیا اور اچ کے راستے اس نے گجرات 8-1177ء میں فتح کیا۔ جس نے 5 سال بعد اسی نے ملتان سے دیبل کا رخ کیا۔ یوں اس نے پورا صوبہ فتح کیا۔ اس سارے حملے میں بھکر کا کہیں ذکر نہیں غالباً اس وقت اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی تاریخ معصومی میں ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے جب ملتان اور اچ فتح کیا تو اس نے اپنا ہیڈکوارٹر ملتان بنایا یہاں سے اس نے اپنے وزیر عبدالرزاق کو سندھ بھیجا جو 417ھ/ 1026ء میں سندھ آ کر بھکر، سیوستان اور ٹھٹھہ فتح کیے[70]۔ (بھکری 45:1959)

ڈیجی جی ٹکری

خیر پور سے 15 میل جنوب کی طرف یہ چار دیواری میں شہر کے کھنڈرات ہیں جو قلعہ کوٹ ڈیجی کے بالمقابل ہیں جو وادیٔ سندھ کے عظیم نے Chalcaithic دور کی نشاندی کرتے ہیں اس ٹیلہ کی کھدائی سے یہ خیال خام ہو جاتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب جامد رہی وادیٔ سندھ کی تہذیب قدرتی طور پر ترقی یافتہ ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ 1946ء میں سر مارٹیمر ویلر نے مختلف قسم کے برتنوں کے ٹکڑوں کو ہڑپہ سے دریافت کیا جنہیں کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی اور انہیں غیر مقامی لوگوں کی اشیاء کہا گیا۔

مگر جو کھدائیاں ڈاکٹر ایف اے خان کی نگرانی میں کوٹ ڈیجی ہوئیں انہوں نے ثابت کیا سر مالیمر ویلر نے جن ٹھیکریوں کی غیر مقامی لوگوں کی اشیاء کہا ہے وہ دراصل ہڑپہ سے پہلے کی ثقافت ہے جس پر یقیناً ہڑپہ کی ثقافت کا اثر ہے۔

قدیم کوٹ ڈیجی چار دیواری کے اندر شہر تھا جہاں حکمران رہا کرتے تھے اور چار دیواری سے باہر عام آبادی تھی آج یہ 40 فٹ اونچا ٹیلہ ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف 600 فٹ لمبائی میں اور 400 فٹ چوڑائی میں ہے۔ اس ٹیلے کی مشرقی سمت سے کھدائیوں سے قابل قدر معلومات مہیا ہوئیں اور تاریخی تواتر کا پتہ ملا اور اس کے مختلف ادوار سامنے آئے ان کھدائیوں سے ہڑپہ سے 300 سال پیچھے کا تاریخی تواتر ملا۔

چند اوپری کھدائیوں سے وادیٔ سندھ کے ایسے Mature Phase کا پتہ ملا جو ہڑپہ ثقافت کے زمانہ سے متعلق تھا۔ اس جگہ کی خاص ظروف سازی ہڑپہ کی ظروف سازی سے ممیز کرتی ہے کوٹ ڈیجی کے اوپر کی سطح سے ملنے والے مٹی کے ظروف کے ٹکڑے کی ٹھیکریوں سے ڈیزائن سے پتہ چلتا ہے کہ ہڑپہ اور کوٹ ڈیجی کے مٹی کے ظروف میں بہت تھوڑا فرق ہے مگر کچے پتھر کی بنی ہوئی ہڑپہ کی مہریں اور مٹی کے انسانی اور حیوانی مورتیاں نایاب ہیں جس میں ایک مہر جس پر یونی کارن ملتا ہے اور تین مٹی کی مورتیاں (ماتا دیوی) اور درجنوں کے حساب سے ملنے والے بیلوں کی مورتیاں ہیں۔

اس سطح کے نیچے کوٹ ڈیجی کی اپنی ثقافت کے آثار ملتے ہیں جو ایک خاص طرح کے مٹی کے برتن کی ٹھیکریاں ہیں جو مٹی کے باریک نازک برتن کی ہیں۔ یہ کمہار کے چاک پر بنائے جانے والے برتن ہیں جو ہڑپہ کے برتنوں سے بہت حد تک ملتے ہیں۔

اگر ہم کوٹ ڈیجی کے اس ٹیلہ سے ملنے والی اشیا کا موازنہ ہڑپہ سے ملنے والی اشیاء سے کریں تو کوٹ ڈیجی کی اشیا یہاں کے باسیوں کے ہنر کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمیں ان کے برتنوں اور مکانوں رہائش بود و باش کا پتہ ملتا ہے۔ ہڑپہ کے باسیوں نے کچھ ڈیزائن کوٹ ڈیجی والوں کے ڈیزائن سے لئے انہوں نے چار دیواری بنانے کا فن

کوٹ ڈیجی والوں سے سیکھا[71]۔ انہی خطوط پر ہڑپہ اور موئن جوڈارو کی چار دیواریاں بھی ہیں۔ کوٹ ڈیجی میں سندھ کے حکمران رہا کرتے تھے جبکہ عام لوگ شہر سے باہر رہا کرتے تھے۔

قلعہ کوٹ ڈیجی ضلع خیر پور:

میر فتح علی خان تالپور تالپوروں کے دور حکومت کا بانی تھا جسنے سندھ میں 1784ء سے 1843ء تک حکومت کی۔ انہوں نے اپنی حکومت کو بہتر طریقے سے چلانے کے لئے قبائلیوں کو ساتھ ملا انہوں نے سندھ کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہر حصہ کو تالپوروں کے خاندان کے فرد کے ماتحت کیا ان میں حیدر آباد خیر پور، میر پور خاص، خیر پور کا حکمران میر سہراب خان تھا جس نے اپنا دارالخلافہ کوٹ ڈیجی بنا کر یہاں 1803ء میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس میں 28 سال کا عرصہ لگا اس قلعہ کا نام احمد آباد رکھا گیا جیسا کہ یہاں ایک فارسی کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے[72]۔

قلعہ احمد آباد بر سنگ است
دل دشمناں از وتنگ است

روایات میں ہے کہ یہ قلعہ احمد نامی فارسی ماہر تعمیر نے ڈیزائن کیا یہ قلعہ دریائے سندھ سے مشرق میں قومی شاہراہ پر 40 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں میر اور تالپور دونوں جنگ اور امن کی حالت میں رہے۔ خیر پور سے اس قلعہ کا فاصلہ 25 کلومیٹر ہے اس قلعہ کی دیواریں 2265 گز جبکہ قلعہ کا مکمل عمارت 94000 مربع گز اس کا داخلی دروازہ لوہے کی میخوں سے بھرا ہوا جسے شاہی دروازہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہیں یہ قلعہ چونے کی 100 فٹ اونچی پہاڑی پر واقع ہے۔

قلعہ عمر کوٹ

عمر کوٹ صوبہ سندھ کا ایک ضلع ہے جو حیدر آباد سے مشرق کی طرف 140

کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے عمر کوٹ کا بانی سومرا قبائل کا سردار عمر سومرہ دوم تھا۔ جس نے سندھ پر 1390-1355ء تک حکومت کی۔ میر علی شیر قانع کے مطابق عمر سومرا کا دارالخلافہ امرائی تعلقہ مٹلی میں تھا جو اس وقت عمر کوٹ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور یہ علاقہ اس وقت راجہ میواڑ کے زیر کنٹرول تھا اور عمومی طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ عمر کوٹ راجہ امر سنگھ نے 11 ویں صدی عیسوی میں بسایا۔ مغل بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری کے حملوں سے 1542ء میں راجہ بیر سال کی دعوت پر عمر کوٹ آیا۔ تاریخ معصومی کے مطابق راجہ اپنے درباریوں کے ساتھ ہمایوں کا استقبال کیا اور اس کے قدم چومنے کا اعزاز حاصل کیا اور اپنی رہائش گاہ اس کے لئے خالی کر دی بادشاہ نے قلعہ کے باہر چند دن قیام کیا اور بلقیس مکانی حمیدہ بانو بیگم کو قلعہ کے اندر بھیج دیا جہاں اکبر 15-اکتوبر 1542ء میں پیدا ہوا[73]۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اکبر قلعہ میں پیدا ہوا یا قلعہ سے ڈیڑھ کلومیٹر شمال کی جانب ایک چھت دار جگہ مقامی زمیندار مہر شاہ نے 1898ء نے بنائی اکبر عمر کوٹ کے قلعہ میں ہی پیدا ہوا جیسا کہ گلبدین بیگم نے ہمایوں نامہ میں بیان کیا ہے جسے مورخین معین الدین اور لاکھو نے بھی ثابت کیا ہے۔ عمر کوٹ قلعہ زیادہ تر سودھا قبائل (راجپوت) کے زیر تصرف رہا جب نادر شاہ نے 1740ء میں سندھ پر حملہ کیا۔

میاں نور محمد کلہوڑا نے اس میں پناہ لی[75]۔ (غلام رسول مہر 1958ء حصہ اول) 1780ء میں یہاں عبدالنبی کلہوڑا نے راجہ جودھپور کی مدد سے میر بجار کو قتل کیا اور اس کے صلے میں یہ قلعہ اسے دے دیا[76]۔ راجپوتوں سے یہ قلعہ میر غلام علی خان تالپور نے 1813ء میں واپس لیا[77]۔ (این اے بلوچ 1996) 1843ء میں اس قلعہ پر برطانوی افواج کا قبضہ ہو گیا آج کے قلعے کو کلہوڑوں نے دوبارہ تعمیر کیا یہ قلعہ مستطیل شکل میں 946x785 فٹ ہے جو پکی اینٹوں سے اور پتھر کی سلوں سے بنایا گیا ہے اس کی اندرونی اور بیرونی دیواریں مخروطی ہیں اس کے 4 برج قدرے گولائی میں ہیں اور اس کی بیرونی چار دیواری 17 فٹ وسیع ہے جو 45 فٹ تک اونچی ہیں جبکہ دیوار کی

موٹائی 8 فٹ تک ہے اس قلعہ میں دشمنوں پر نظر رکھنے کے لئے ایک بلند جگہ ہے جہاں کبھی سات توپیں رکھی جاتی تھیں اس قلعہ میں محکمہ آثار قدیمہ پاکستان نے 1948ء نے ایک عجائب گھر قائم کر رکھا ہے اور میں یہاں گورنمنٹ کی طرف سے سرکٹ ہاؤس بھی قائم کیا گیا۔ جبکہ آئی۔ایچ ندیم اس قلعہ کے بارے لکھتے ہیں اس کی قلعہ کی بنیاد عمر سومرو II کا نام منسوب کیا جاتا ہے[78]۔ جس نے 1390-1355ء تک یہاں حکومت کی جبکہ کچھ مؤرخین اسے امرکوٹ کا نام دیتے ہیں۔ اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ قلعہ چودھویں صدی عیسوی سے بھی پہلے کا ہے ان کے مطابق جب امرکوٹ کے راجہ سوڈھا کی بیٹی سے بدونشی راجہ مانڈم رائے کی شادی ہوئی اس وقت 616 سمت میں راجہ مانڈم رائے کی گدی تھی جو 559ء کا زمانہ بنتا ہے بہر حال امرکوٹ اس وقت موجود تھا اس طرح...... عمرکوٹ یا امرکوٹ کو سوڈھا راجہ عمر سومرہ کسی نام سے بھی پکارا جائے یہ قلعہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا عمرکوٹ شہر مگر دیکھنے میں قلعہ کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ اتنا پرانا نہیں یہ قلعہ نور محمد کلہوڑا نے 1746ء میں بنوایا[79]۔ یہ بیان کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ کچھ مؤرخین بتاتے ہیں کہ میاں نور محمد کلہوڑا نے پرانا قلعہ گرا کر یہ نیا قلعہ بنوایا وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اکبر کی جائے پیدائش کے مقام پر اگرچہ قلعہ تھا مگر اس جگہ پر قلعہ کے کوئی نشان موجود نہیں ہیں یہ قلعہ لمبائی میں 292 میٹر اور 228 میٹر وسیع اور اس کی بیرونی چاردیواری 3 میٹر موٹی جو قدرے ترچھی اندرونی اور بیرونی طور پر ہیں اس کے چاروں کونوں پر 4 قدرے گولائی دار بروج ہیں ان میں سے ایک برج تو مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور دوسرا بھی گرنے والا ہے ان برجوں کی سامنے کی دیواریں سورج سے ہلکی پکی ہوئی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔

اس کا داخلی دروازہ شاہی دروازہ کہلاتا ہے جو قلعہ کی مشرقی دیوار ہے نقشہ کے مطابق یہ خفیہ سا راستہ ہے ان کے اوپر محراب ہے یہ حصہ جو بعد کی تعمیر ہے داخلی دروازہ کے دونوں برج گھوڑے کے سموں سے مشابہ ہیں۔ جو رائے دین سنگھ کے گھوڑے کے

سموں سے منسوب ہے جب رائے رتن سنگھ کو قلعہ میں پھانسی دی جا ہی تھی تو اس کے گھوڑے نے پھلانگنے کی کوشش کی تھی۔

قلعہ کی شمال مغربی طرف سنگ کھٹو زرد پتھر کی آٹھ ستونوں پر ایک چھت کے نیچے ایچ دی وِلسن کی قبر ہے جو یہاں تھر اور پارکر ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا اس کی قبر پر تین انگریزی کے کتبے لگائے گئے ہیں۔

اکبر کی جائے پیدائش

عمر کوٹ کا چھوٹا سا قصبہ جو ریت کے ٹیلوں کے کنارے پر سندھ کے مشرقی صحرا کو ایک کرتا ہے۔ یہاں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی جائے پیدائش ہے یہ جگہ ایک چھت دار احاطہ سا ہے جو 1898ء میں مقامی زمیندار سید مہر شاہ نے تعمیر کیا اس کے مشرقی جانب پتھر کا کتبہ موجود ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

یہ جگہ بادشاہ اکبر کے اعزاز میں بنائی گئی جو 1542ء میں یہاں پیدا ہوا اس نے 49 سال 1556-1605ء تک حکومت کی یہ تعمیر جدید اینٹوں سے کی گئی ہے جس کے اوپر گنبد نما چھت ہے جو 50x50 ہے جو عمومی سی تعمیر ہے[80]۔

قلعہ نوکوٹ

میر پور خاص سے جنوب کی طرف ایک سڑک صحرائے تھر کو جاتی ہے 65 میل سفر کے بعد ایک چھوٹا قصبہ آتا ہے جسے نوکوٹ کہتے ہیں یہاں سے کچھ دور مٹھی روڈ پر یہ قلعہ ہے۔ یہ علاقہ محض جنگل کا علاقہ ہے یہاں آبادی نہیں۔ یہ قلعہ میر کرم علی خان نے 1814ء میں بنوایا[81]۔ یہ قلعہ 600x640 فٹ جو پکی اینٹوں سے بنایا گیا ہے اس کی بیرونی دیواروں کی موٹائی 15 فٹ تک ہے اس کے شمال مغربی حصہ کونہ میں محرابی داخلی دروازہ ہے جسے شاہی دروازہ کہتے ہیں۔ جس کے دائیں بائیں قدرے گول برج ہیں ہر برج تیس فٹ تک اونچا ہے اور اس کا محیط 140 فٹ تک ہے داخلی راستہ جس پر

چھت ہے چڑھائی کی شکل میں 40x48 فٹ جو 25 فٹ اونچی 20 فٹ موٹی دیوار سے محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ قلعہ کے اندر داخلہ ایک چھت دار راستہ سے ہے جس کی چڑھائی کے بعد آخر میں دروازہ آجاتا ہے جس کے دونوں اطراف محرابی طاقچے ہیں جہاں سپاہی بیٹھا کرتے تھے قلعہ کی چاردیواری کے ساتھ بیرکیں ہیں جو غالباً بارودخانہ کے لئے استعمال ہوتی ہوں گی یا قیدیوں کے رکھنے کے لئے ہوں گی اس قلعہ کے کل 9 برج ہیں شمالی طرف تین جنوبی طرف اور مغربی طرف میں قلعہ میں ایک کنواں بھی ہے اس قلعہ نے میر کرم علی خان کی زندگی میں رونق دیکھی ہوگی مگر اس کی وفات کے بعد کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ تاری خان کے زمانہ میں یہاں فوج متعین کی گئی تاری خان 1829ء میں فوت ہوا تو اس کی جگہ شیر محمد خان نے سنبھالی جسے شیر سندھ کہا جاتا ہے۔ وہ تھر کی اہمیت کو بخوبی جانتا تھا اور صحرا کو اپنے زیر تسلط لانا چاہتا تھا وہ اپنے آپ کو بشمول نوکوٹ پوری طرح چاک وچوبند اور ہتھیار بند رکھنا چاہتا تھا اس نے کئی مرتبہ اس قلعے کا دورہ کیا۔

ان دنوں برصغیر میں انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا اس دوران انہوں نے نہ صرف میروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت شروع کردی تھی بلکہ انہوں نے ان سے مل کر لالچ دے کر حکمرانوں کے خلاف سازشوں کا جال بننا شروع کردیا جب حیدرآباد اور خیر پور کے میروں نے انگریزوں سے دوستانہ مراسم کر لئے تو میر پور میرس کے حکمران میر شیر محمد نے انگریزوں سے بدلہ لینے کی ٹھانی اس نے اپنی فوج کو حیدرآباد کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا جہاں اس نے چارلس نیپر کی فوج کا سامنا دُبی اور پھلیلی میں کیا تو درباری سازشوں کی وجہ سے اس کا حال خیر پور اور حیدرآباد سے مختلف نہ ہوا دبی میں دھوکہ سے شکست کھانے کے بعد شیر محمد نصر پور سے میر پور آگیا جہاں سے اس نے اپنے خاندان کو تھر بھیج دیا اور اپنا ساز وسامان بھی صحرا میں بھیج دیا وہاں اس نے اپنے بکھرے ساتھیوں کو اکٹھا کیا جہاں اس نے میروں کی دادرسی کی برطانوی افواج کے

ساتھ گوریلا کاروائیاں شروع کردیں۔ ایچ۔ ٹی لیمبرک نے اپنی کتاب جان جیکب آف جیکب آباد میں ان کاروائیوں کی تفصیل دی ہے میر کے آدمیوں نے انگریزوں کی ترسیل بمبئی اور سندھ سے کاٹ کر رکھ دی جان جیکب نے دوسکوارڈن فوج نوکوٹ قلعہ بھیجی جبکہ نیپئر اس کے منصوبہ سے راضی نہ تھا اس نے اسے ٹنڈو محمد خان سے حملہ کرنے کا مشورہ دیا جو حیدرآباد سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے یہاں پر برطانوی افواج شکست سے دوچار ہوئیں اور واپس آ گئیں۔

میر شیر محمد برطانوی افواج کے لئے دردسر بنا ہوا تھا۔ اور سندھ کے بہترین مفاد میں اس نے تھر یہ قلعہ خوب استعمال کیا اور میر شیر محمد نے اس قلعہ کو اپنی مرضی کے مطابق متعدد بار استعمال کیا صحرائے تھر میں ہونے کی وجہ سے یہ قلعہ بری طرح نظرانداز کیا گیا قلعہ کے اندر اب چند کمروں کے آثار موجود ہیں[82]۔ وہ فوجی بیرکیں یا قیدیوں کے رکھنے کی جگہ یا قلعہ کی دیکھ بھال کرنے والوں کے کمرے ہو سکتے ہیں۔ ان چھوٹے کمروں پر گنبد ہیں۔ یہ بارود رکھنے کی جگہ بھی ہوسکتی ہیں۔ اس قلعہ کے نزدیک دریا کی آبی گزرگاہ ہے جو اب خشک ہیں قلعے میں پانی کا ذریعہ ایک کنواں ہے۔

بھیرو کا ٹیلہ شیرواہ نتو جو ڈرو تھرپارکر

یہ ٹیلہ بھیرو ضلع تھرپارکر میں ہے جہاں سے چند ٹھیکریاں ملتی ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ٹیلہ زمانہ ماقبل از تاریخ سے متعلقہ ہے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب 2500BC-1600BC:

وادیٔ سندھ کی تہذیب پر اب تک 6000 سے 7000 تک کتابیں اور آرٹیکل چھپ چکے ہیں ان میں سے 200 ضروری ٹائیٹل ایم ایچ پنہور کی کتاب میں دیے جا چکے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب مصر اور بابل کی تہذیب کے ہمعصر رہی۔ موئن جو ڈارو کے کھنڈرات ڈوکری ضلع لاڑکانہ کے قریب 2500 قبل مسیح کے ہیں۔ اسی دور

میں عکادی عراق میں حکمران تھے مصر پر فرعونوں کی حکومت تھی مصری 3000 قبل مسیح تک اپنی تہذیب کی بلندیوں تک پہنچ چکے تھے کوٹ ڈیجی اور موئن جوڈارو کی بنیاد سے قبل ہی مصری تہذیب اپنے بام عروج پر تھی۔ ادھر سومیری 2500 ق م سے 500 سال قبل پھلے پھولے جو موئن جوڈارو کے ہمعصر تھے۔ اور ان کے ایک دوسرے سے روابط کا پتہ بھی ملتا ہے[83]۔

سومیری جو بابلی تہذیب کے بانی تھے ہوسکتا ہے موئن جوڈارو کے باسی انہی کا حصہ ہوں۔ جنوبی بلوچستان فارس اور مغربی ایران خوزستان سومیریوں کی دکن کے دراڑوں اور بلوچستان کے بروھیوں اور جنوبی ایران فارس کے کچھ علاقوں کی زبان میں ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

موئن جوڈارو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب ہڑپہ کی کھدائیاں جاری تھیں جب آر ڈی بینر جی موئن جوڈارو سے دوسری صدی عیسوی کے بدھسٹ سٹوپا کی تلاش میں تھے تو انہیں یہاں ہڑپہ جیسے آثار ملے جو یہاں سے 800 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے ضلع ساہی وال پنجاب میں واقع ہے تو ماہرین آثار قدیمہ کے تحت یہاں 23-1922 سے 1931ء تک سر جان مارشل کی سربراہی میں سائنسی بنیادوں پر کھدائیاں شروع کر دی گئیں اور جہاں جہاں جس جس نے کھدائیاں کیں وہ علاقہ اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا[84]۔ ان ماہرین آثار قدیمہ میں اے ڈی صدیقی کے این ڈکشٹ اور ایچ آر ہرگو یاس اور ایم ایس وتس، اور ایل دھاما شامل تھے[85]۔

آزادی کے بعد معروف ماہر آثار قدیمہ سر مارٹیمر ویلر اس وقت حکومت پاکستان کے آثار قدیمہ کے مشیر تھے 1950ء میں یہاں کھدائیوں کا آغاز کرایا۔ اگرچہ یہ کھدائیاں کرنا ممکن نہ رہا کیونکہ زمین میں پانی کی سطح نہایت کم فاصلے پر تھی۔ گہری کھدائیوں کے لیے امریکن ماہر آثار قدیمہ جارج ایف ڈیلز کی سربراہی میں ایک ٹیم پاکستان آئی اور محکمہ آثار قدیمہ کے تعاون سے 65-1964ء میں کھدائیاں کی گئیں

HR ایریا میں کھدائیاں ہوئیں مگر یہ ٹیم بھی گہری کھدائیوں تک نہ پہنچ سکی۔ محکمہ آثا قدیمہ نے 1987ء میں دریائے سندھ پر بند کی وجہ سے جب دریا نے اپنا رخ بدلا تو اس عظیم الشان شہر کے نقوش دھرتی پر ابھرنے لگے یہ کھدائیاں سٹوپا سے 2.5 کلومیٹر دور SD ایریا میں کی گئیں اوران آثار کی بیرونی دیواریں تلاش کرنے کے بارے سوچا جانے لگا اس طرح یہ خیال پیدا ہوا کہ اس قدیم شہر کے آثار دریا کا رخ بدلنے کی وجہ سے پانی کے نیچے چلے گئے اسی دوران اٹلی جرمنی اور پاکستانی ماہرین آثار قدیمہ کی ٹیموں 1986ء مشترکہ تحقیق شروع کی اوراس شہر کے نقشے تیار کرائے گئے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ سارے شہر کا صرف 10 فیصد حصہ کی کھدائیاں ہی کی جا سکی ہیں۔ باقی ماندہ کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا کیونکہ 1/10 حصہ کی بحالی بھی ابھی تک ممکن نہیں۔ یہ سائٹ دریائے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے اس کا ایریا 450,000 مربع میٹر ہے اور اونچائی عام سطح سے پانچ سے 7 میٹر اور مغرب کی طرف 80,000 مربع میٹر بڑی ہے۔ سارے کے سارے ٹیلے ٹھیکریوں سے لتھڑے پڑے ہیں اور بڑی تعداد میں پکی اینٹوں کے گھر کنویں اور دیگر آثار ملتے ہیں سب سے اونچے ٹیلے کی احتیاط سے کھدائی سے دوسری صدی عیسوی کے عظیم الشان سٹوپا کے آثار نمایاں ہوئے جو سورج کی تپش سے پکائی گئی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔

اس سٹوپا کے مغربی جانب تین گریٹ باتھ کے آثار ملے جن میں سے وسطی تالاب 12x7 میٹر کا ہے اینٹوں کے ستونوں پر کھڑے برآمدے کے آثار بھی ہیں جو صحن کے 2.5 میٹر نیچے ہیں باتھ کے فرش تک پہنچنے کے لئے دو سیڑھیاں شمالاً جنوباً ہیں۔ جن کے اڈوں پر لکڑی لگ اور اسفالٹ سے لگائی گئی ہے اس بڑے تالاب کا فرش کھڑی اینٹوں سے جپسم کے پلاسٹر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ پلاسٹر دیواروں پر بھی نظر آتا ہے جس کے پیچھے 2.5 سنٹی میٹر لوئی لگ کی تہہ جمائی گئی ہے تاکہ سیم سے محفوظ رہا جا سکے اور بیرونی سطح پر اینٹوں کی ایک دیوار سے اسے چھپایا گیا ہے۔ اس باتھ کی

ڈھال جنوب سے مغرب کی طرف رکھی گئی ہے جس کا پانی اس سیوریج میں گرتا تھا جو پہلے شمال اور پھر جنوب کی جانب چلی گئی ہے۔ باتھ کو پانی کی سپلائی کے لئے نالیاں بنائی گئی ہیں۔ تالاب کے سامنے شمال میں آٹھ باتھ روم جو دو قطاروں میں بنائے گئے ہیں ممکن ہے کہ پروھتوں کے لئے ہوں ان باتھ رومز کا فن تعمیر جداگانہ ہے جن کے فرش مضبوطی سے بنا کر ان پر چمکدار پلاسٹر کر دیا گیا ہے۔

گودام

اس تالاب یا باتھ رومز کے مغرب میں اناج سٹور کرنے کا گودام ہے اسی طرح کا ایک گودام ہڑپہ کی کھدائیوں کے دوران بھی ملا تھا، جس میں ہوا کے گزر کے لئے راستے بنے ہیں تا کہ سٹور شدہ اناج خراب نہ ہو۔

تعلیم کے لئے عمارت اسکول

اس باتھ کے شمال مشرقی حصہ کی جانب اور سٹوپا کے مغربی سمت ایک بڑی سی عمارت کے آثار ہیں جس کے تین اطراف بیرکوں کی طرح کے کمرے ہیں جو عمومی طو پر عام رہائش کے لئے استعمال نہیں ہوتے ہوں گے ابھی تک ان کے استعمال کے بارے واضح نہیں ہو سکا تاہم ہو سکتا ہے یہاں تعلیمی سرگرمیاں ہوتی ہوں یا پھر پروھتوں کے کمرے ہوں۔

اسمبلی ہال:

سٹوپا کے جنوب میں ایک اور عظیم الشان عمارت کے آثار موجود ہیں جو ایک بڑے ہال پر مشتمل ہے جس کے 20 ستون 4 قطاریں ہیں اور ہر قطار میں 5 ستون ہیں۔ یہ عمارت یا تو حکمرانوں کے اجلاس کی جگہ ہو گی یا کوئی کمیونٹی سنٹر یا عبادت گاہ ہو سکتی ہے۔

عام شہر:

موئن جوڈارو کے گردونواح میں ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہے جہاں آثار قدیمہ کے تحت کھدائیاں کی گئی ہیں جن سے پتہ چلا کہ یہ ایک بہت بڑا شہر تھا جو مشرقی سمت اور جنوبی سمت کو پھیلا ہوا ہے۔

کے این ڈکشٹ ایریا:

موئن جوڈارو کا وہ حصہ جہاں کے این ڈکشٹ نے کھدائیاں کی تھیں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شہر ایک بہترین ٹاؤن پلاننگ کا نمائندہ شہر تھا اس کی بڑی گلی شمالاً جنوباً ہے اور مشرق مغرب سے جسے دوسری گلیاں اس طرح کاٹتی ہیں کہ وہ علاقہ بلاکوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اس گلی کے دونوں اطراف پکی اینٹوں کی دیواریں ہیں جو 6 سے 9 میٹر تک اونچی ہیں اور بہت کم گھروں کی کھڑکیاں اس گلی کی طرف کھلتی ہیں اور گھروں کے دروازے اور کمروں کا رخ اور وسط میں کھلا صحن رکھنے کی اجازت تھی اس کا سیوریج سسٹم کسی بھی شہر کے سیوریج سسٹم سے عمدہ تھا۔

حکمران کا گھر Chiefs house

موئن جوڈارو میں دوسرے گھروں کے مقابلہ میں ایک ماڈل گھر موجود ہے جو دوسرے گھروں سے بڑا ہے جو اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کسی بڑے پروہت یا حکمران کا گھر معلوم ہوتا ہے یہ DC ایریا کے جنوب میں واقع ہے جس کے 2 صحن ہیں جن کا دروازہ 2.5 میٹر کھلا ہے اس میں دو کنویں ہیں اور کھانا کھانے کی جگہ ہے اور سیڑھیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی دوسری منزل بھی تھی۔ یہ تمام کھنڈرات قلعہ بند اور چار دیواری سے مرصع تھے۔

پنجاب کا فن تعمیر

کسی علاقے یا خطے کا فن تعمیر کبھی ساقط نہیں رہتا یہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ حالات کے پیش نظر کسی ایک خصوصیت کی جگہ دوسری خصوصیت لے لیتی ہے عمومی طور پر فن تعمیر میں یہ تبدیلیاں ارضیاتی، جغرافیائی، موسمی، مذہبی، سماجی، معاشی اور تاریخی نقطہ نظر سے آتی ہیں جب مذہبی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو فن تعمیر بھی تغیر پذیر ہوتا ہے۔

پنجاب کے فن تعمیر کے مطالعہ سے پہلے بہتر ہوگا کہ ہم اس خطے کی سماجی، مذہبی، معاشی تاریخ کی تبدیلیوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ پنجاب میں ایک بھی ایسا علاقہ نہیں کہ جہاں داخلے کے لیے حملہ آوروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے ہر حملہ آور اپنے خطے کے فن تعمیر، لباس، سماجی ثقافتی اثرات لئے شمال مغربی دروں سے یہاں آتا رہا۔ جس کے ذریعے نت نئے خیالات اور نظریے یہاں وارد ہوئے مگر ثقافتی لحاظ سے پنجاب کی سرحدیں عمومی طور پر کھلی رہیں حتیٰ کہ زمانہ امن میں لوگ سرحدوں پر رہنے والے لوگوں کے اثرات سماجی اور معاشی طور پر ایک دوسرے سے لیتے رہے ان لوگوں کو جنوبی ایشیا کی زرخیز زمینوں نے ہمیشہ متاثر کیا جہاں ایک مستقل کشش تھی جس نے اس علاقے کے لوگوں کی زندگیوں پر فن تعمیر کے حوالے سے خوشگوار اثرات چھوڑے۔ یہ خطہ جغرافیائی سرحدوں کے حوالے سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ علاقائی تمدن کے حوالے سے اس خطے میں ایک جیسی خصوصیات نہیں۔ حتیٰ کہ زبان بھی کچھ فاصلہ پر جا کر تبدیل ہو جاتی ہے بے شک تاریخی عمل سے ہر جگہ یہی محسوس کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کا فن تعمیر بہت سے فن تعمیر کا مجموعہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی واضح نشاندہی قریباً ناممکن ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ پنجاب میں ارضیاتی طور پر پہاڑ، سطح مرتفع میدان، صحرا، دریائی گزرگاہیں، دوآبے ہیں۔

یہاں دوآب کی زندگی دوسرے علاقوں سے یکسر مختلف ہے۔ چھوٹے علاقوں کے علاوہ پنجاب کا موسم گرمیوں میں گرم بہ مرطوب مگر سردیوں میں سرد اور موسم خزاں اور بہار میں موافق ہوتا ہے۔ یہاں کا فن تعمیر یہاں کے باسیوں کے دل کی طرح وسیع اور روشن ہے۔

ندی نالوں دریاؤں کی گزرگاہ ہونے کی بنا پر اس سرزمین کے میدانی علاقوں میں مٹی اور ریت کے بے شمار ذخائر موجود ہیں اور اینٹوں کے لئے وافر مٹی مہیا ہوتی ہے سورج کی تپش اور بھٹی سے ٹائلیں اور اینٹیں پکانے کے لئے بنیادی سامان موجود ہے اور پہاڑوں سے علاقائی پتھر بھی میسر ہے۔ جہاں پر اس کی کٹائی اور کھدائی کے لیے بہترین ہنرمند موجود ہیں۔ ایسے علاقوں میں ٹیکسلا، اٹک، رہتاس، نندنہ، کٹاس، روات جیسے علاقے شامل ہیں۔ بہت کم جگہیں ایسی ہیں جہاں سرخ، نیلا پتھر اور سنگ مرمر کسی دوسری جگہ سے لا کر عمارت میں لگایا گیا ہو۔ ایسا عموی طور پر شاہی سرپرستی میں بننے والی عمارتوں کے سلسلہ میں کیا گیا ہے[86]۔

پنجاب کو یونانی زبان میں pentepotamos (پانچ دریاؤں کی سرزمین) اور سنسکرت میں پنجند کہا گیا ہے۔ یہ علاقہ حملہ آوروں کے لئے ہمیشہ سے کشش رکھتا ہے ہر نیا حملہ اور اپنے ساتھ نت نئے خیالات اور فن تعمیر کے مختلف طریقے لایا جس سے یہاں ایک نئی روایات کا اضافہ ہوا یہاں پرانے اور نئے کی جنگ ہمیشہ رہی اور فاتح اور مفتوح ایک دوسرے میں مدغم رہے۔

دوسری طرف پنجاب ایک ایسا خطہ ہے یہاں بہت سے مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ اس سرزمین نے ویدک دور سے پہلے کے آباد کار بھی دیکھے ویدک دور، ہندومت، جین مت اور بدھ مت کے زمانے بھی دیکھے۔ یہاں تک کہ یونانی اور ان

کے پیروکار۔ کشان آسمانی بجلی کی پوجا کرنے والے اور ایرانی آگ اور سورج کی پوجا کرنے والے دیکھے۔ ان کے بعد مسلمان سکھ اور عیسائی آئے۔ اس خطہ میں ایک ہی وقت میں مختلف مذاہب کے لوگ بھی رہے جو فن تعمیر میں اپنی اپنی عبادت گاہوں کے لحاظ سے اگرچہ منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔ مسجد، مندر، گوردوارہ، گرجا کے فن تعمیر کو ایک انجان بھی محسوس کر سکتا ہے اسی طرح مدرسہ، پاٹ شالہ، سرائے، دھرم شالہ، سمادھ، مقبرہ، قبرستان، شمشان بھومی، تکیہ، ویہار کو مذہبی نقطہ نگاہ سے ایک دوسرے سے منفرد رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی پنجاب کا ایک یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ کسی اور جگہ کے مقابلے میں یہاں بہت سے مذاہب ثقافتی پہلو، مذہبی پہلو، سماجی اور معاشی پہلو ایک ہی جگہ نظر آتے ہیں۔ ویدک سے قبل کا دور ہمیں ہڑپہ سے ملتا ہے۔ پہلا یونانی معبد ٹیکسلا میں بنایا گیا جبکہ پہلا پارسی معبد بھی ٹیکسلا ہی میں قائم ہوا۔ گندھارا پنجاب میں بدھ ازم کے حوالے سے ایک متبرک جگہ ہے اور اسلام کے پھیلاؤ کے لئے اس خطہ کا اہم مقام ہے۔ پورے ہندوستان میں اسلام اُچ شریف ملتان اور لاہور کے راستے پھیلا دوسرے نقطہ نظر سے بھی پنجاب ایک منفرد تجربے سے گزرا۔ اس کے جغرافیائی خدوخال کی بنا پر پنجاب ہزاروں سال سے انسانی تحریکوں کا دروازہ رہا ہے۔ جو وسطی ایشیاء ایران اور مغرب کی طرف سے آنے والی یلغاروں کی زد میں رہا ہے۔ اگرچہ اس دروازے سے حملہ آور، علاقائی تمدنی جمعیت، قافلے، تاجر، عالم اور سچائی کے متلاشی بھی آئے۔ یہ آمدورفت پنجاب میں ہمیشہ جاری وساری رہی، یہاں دریاؤں سے آبپاشی کے نظام کو ہمیشہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ سڑکیں، بحری کشتی، قلعوں کی تعمیر، رباط، سرائے، باؤلیاں، کوس مینار، پڑاؤ وغیرہ۔ ایسی عمارتوں نے یہاں ایک خاص فن تعمیر کی بنیاد رکھی۔ ایسی عمارتوں کی پنجاب میں کوئی کمی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے ایسی متنوع فنی مہارت پاکستان میں صرف پنجاب ہی میں دیکھنے میں آتی ہے۔

پرانے وقتوں میں اور ایندھن سے چلنے والے انجنوں کے ساتھ دریائی ٹریفک

اور پن چکیوں نے پانی کے ذخائر کے قریب رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تمام اہم شہروں اور قصبوں کی تعمیر پانی کے ذخائر دریائی کناروں کے قرب و جوار میں ہوئی پنجاب اس سلسلہ میں خاصا خوش نصیب ہے کہ یہاں کافی چھوٹے بڑے دریا موجود ہیں۔ ماضی میں یہاں شہری آبادیوں کے لئے خاصے موافق حالات تھے یہاں اکثر تہذیبوں کا ارتقاء ممکن تھا ایسے شہروں میں ٹیکسلا، ہڑپہ، لاہور، اُچ، ملتان، سودھرہ، چنیوٹ، بھیرہ، خوشاب، اٹک، شورکوٹ، جھنگ وزیر آباد قابل ذکر ہیں۔ شہروں میں عمارتوں کی بھر مار کا مطلب فن تعمیر کی ترقی ہی ہے آج کی تحقیق کے مطابق یہ ثابت ہے کہ ہڑپہ تہذیب کا مرکز اور اس کی معاشی مضبوطی دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا تھے۔

شہری زندگی کی شروعات پنجاب میں ہڑپہ اور ٹیکسلا سے ہوئی بلکہ ٹیکسلا سے قبل Hippodamean ٹاؤن پلاننگ سکندر نے پنجاب میں متعارف کرائی جہاں اس نے کئی تاریخی شہر اسکندریہ نام کے بسائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے دور حکومت میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے نقطہ نظر سے جو کردار لاہور، ملتان، دیپالپور اور اُچ نے ادا کیا اس کی مثال آج بھی پاکستان کے کسی اور صوبے میں ملنی مشکل ہے۔ بھنبھور اور منصورہ بلاشبہ ابتدائی اسلامی دور کے شہر ہیں لیکن بعد میں آنے والے ادوار میں ان کا کردار ابھی تک تحقیق طلب ہے۔

شمال مغرب سے تمام اہم حملہ آور سب سے پہلے پنجاب سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ اور اگر پنجاب یہ جنگ ہار جاتا تو دہلی تک انہیں روکنے کی استطاعت کوئی نہ رکھتا تھا۔ اس طرح پنجاب پورے ہندوستان کے تحفظ کی ضمانت رہا ہر حملہ آور اپنے ساتھ تباہی بربادی لاتا اور شہروں اور عمارتوں کے کھنڈرات میں نمایاں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ملتان، اُچ، دیپالپور اس کی روشن مثالیں ہیں۔ پنجاب کی آبی گذرگاہیں خود پنجاب کے فن تعمیر کے لئے ایک مصیبت بن گئیں ان دریائی گذرگاہوں نے تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ راستے میں آنے والے شہروں، عمارتوں کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے

میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سکندر کے زمانے چار شہر اسکندریہ بھیرہ، خوشاب اور ملتان اور لاہور کی عمارتیں دریائی دستبرد کا بار بار شکار ہوتی رہیں مختلف ثقافتی یلغاروں نے بہت کم عمارتیں باقی چھوڑیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے پنجاب کی عمارتوں کا ایک مکمل سروے کرایا جس سے پتہ چلا کہ پاکستان میں غزنوی دور کی کوئی عمارت موجود نہیں ہے۔ مگر آج کبیر والا ملتان کے نزدیک مقبرہ خالد بن ولید اس کے امکان کو رد کرتا ہے پنجاب کے ایک مکمل سروے کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد یہاں کے فن تعمیر کو سمجھنا اور بھی آسان ہو جائے گا۔

جغرافیائی حالات اندرونی خلفشار اور بیرونی حملہ آوروں اور آبادی کی یلغارِ جھیلنے والے اس عظیم خطے نے باہر سے آنے والے اور اندر رہنے والوں نے اپنے بیرونی اثرات اور اندرونی اثرات سے مزین عمارتیں تعمیر کیں جو اپنے آفاقی خدوخال کی وجہ سے پاکستان بھر میں ممتاز ہیں۔ پنجابی کردار کا مطالعہ دوسروں کے اثرات کو کھلے بندوں قبول کرنا اور دوسری تہذیب کے اثرات اپنے اندر قبول کرنا یا نظر انداز کرنا ضرورت کے مطابق تبدیلی کرنے کا انہیں کوئی دکھ نہیں، نئے لوگ نئے انداز نئی تحریکیں نئی لہریں ہر دم اپنا کر انہیں پنجاب میں تحفظ فراہم کیا گیا۔ پنجاب کے لوگ دوسرے لوگوں کی امداد کے لئے ہر دم تیار رہتے ان کا مذہب اپنانے ان کی ثقافت اور انہی کے انداز کی عمارتیں بنانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ وقت اس بات کا بہترین گواہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں نے اپنا رشتہ اس مٹی سے استوار رکھنے کے لئے کیا کھویا کیا پایا۔ اس علاقہ میں ہر کسی کی اپنی پسند کا فن تعمیر ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔

پنجابی معاشرہ ہمیشہ سے جنگ مخالف رہا مگر ساتھ ہی بہادری کے بے شمار ریکارڈ قائم کئے پنجابی مہمان نواز ہمیشہ سے اجنبیوں کو خوش آمدید کہنے والے دوست رہے پنجاب ایسی جگہ ہے جہاں مختلف ثقافتی لوگ باہم مل کر رہتے ہیں اگر وہ اس زمین پر نہ بھی ہوں تو ہر جگہ وہ اس کی مٹی کے بیٹے ہیں وہ عالمی بھائی چارے کے خواہاں ہیں۔

پنجاب کا فن تعمیر تاریخی نقطہ نگاہ سے اور پنجابی کردار کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے اور اسی طرح فن تعمیر میں ہمارا عروج وزوال اسی حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

مغلوں کے عہد میں (1526ء-1761ء) بابر تعمیرات کا دلدادہ تھا ترکی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہمراہ دو زبردست معمار یوسف اور عیسیٰ کو یہاں لایا جو معروف ترکی معمار سنان کے شاگرد تھے انہوں نے بڑی اعلیٰ عمارتیں اپنے ذوق کے مطابق بنائیں جواب پیوند زمین ہو چکی ہیں۔ ہندوستان پر قابض ہوتے ہی اس نے آگرہ میں ایک خوبصورت باغ لگوایا۔ وہ اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ یہاں (ہندوستان) میں جس تعداد میں جس قدر جس قسم کی دستکار درکار ہوں مل سکتے ہیں اس نے عمارات بنوانے کا کام ملا قاسم استاد شاہ محمد سنگتراش، میرک غیاث، میر سنگ تراش اور شاہ بابا (کدال باز) کے سپرد کیا۔ نصیر الدین ہمایوں جنگ و جدال میں مصروف رہنے کے سبب اگرچہ کم توجہ تعمیرات کی طرف دے سکا تاہم اس کی چند یادگاریں آگرہ، حصار اور دیگر مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ تاہم لاہور میں میرزا کامران کی بارہ دری اسی دور کی یادگار ہے۔

اکبر 1555ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی یادگاروں میں لاہور کا قلعہ دور جامع مسجد فتح پور سیکری، شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ، لاہور کے قلعہ میں کچھ عمارات اکبر نے فتح پور سیکری کی طرز پر تعمیر کیں[87]۔ اسی طرح گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع الہ آباد میں اکبر نے ایک محلاتی قلعہ (ارک) بنایا۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے عہد میں پنجاب میں قلعہ لاہور، قلعہ شیخوپورہ، ہرن مینار، مقبرہ انارکلی، واہ گارڈن اور کئی عمارات تعمیر ہوئیں جبکہ عہد شاہ جہانی میں تاج محل کے معماروں میں استاد احمد اور حامد کے نام درج ذیل ہیں جنہیں شاہ جہاں نے دہلی کی عمارات کی تعمیر کے لئے 1638ء میں مامور کیا۔ احمد کا پسر ثانی لطف اللہ تاج محل کی تعمیر اور عمارات دہلی کی تعمیر اپنے والد کے نام بتاتا ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں پنجاب میں متعدد عمارات تعمیر ہوئیں۔ جن میں قلعہ لاہور کی موتی مسجد،

شیش محل، شالامار باغ مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہان اور متعدد مساجد مقابر اسی دور میں تعمیر کیے گئے۔ مغلوں کے ذوق جمال کے نمونے پنجاب میں قدم بہ قدم آج بھی ان کی فن تعمیر سے وابستگی رقم کر رہے ہیں[88]۔

پاکستان میں فوجی فن تعمیر قلعے

تاریخ کے اس دور میں جب انسان نے بستیاں بسا کر رہنا شروع کیا تو آبادی کے گرداگرد انہیں ایک ایسے حصار کی ضرورت پیش آئی جو جنگلی جانوروں، حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کر سکے۔ اس خیال کے پیش نظر جہاں جہاں بھی آبادیاں بنائی گئیں۔ وہاں پر بیرونی چار دیواریاں قائم کی گئیں[89]۔ اس کے لئے ہمیں دنیا کی پرانی تہذیبوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو اپنے ارتقائی عمل سے گزر رہی تھیں۔ اپنے اپنے علاقائی خدوخال کے مطابق اور جنگی نقطۂ نگاہ سے ہر قسم کا خام مال اس علاقے کی نوعیت کے مطابق میسر آ جاتا[90]۔ یہ تبدیلی محض اونچی مٹی کی دیواروں سے پتھر کی اونچی دیواروں یا چونا گچ کی طرف رجحان نہیں بلکہ یہ ملکی طور پر عمارت اور فن تعمیر میں ترقی کا ایک منظر عام ہے۔ جس کا ہمیں جائزہ لینا ہے[91]۔

ہماری تہذیبوں کے ابتدائی دور میں ہم اپنی آبادیوں کے گرداگرد کچی مٹی کی اینٹوں کی دیوار بناتے تھے۔ اس کے بعد دھوپ اور بھٹی میں پکائی گئی اینٹیں استعمال ہونے لگیں آخر میں پتھر اور چونے گچ سے دیواریں تیار ہونے لگیں، اس میں استعمال ہونے والا میٹریل اپنے دور کی خوب نمائندگی کرتا ہے۔ تاریخ میں ہمیں بہت سی دیواروں کا تذکرہ ملے گا۔ بعد میں یہی دیواریں آبادیوں کے گرد بنادی گئیں قلعوں، حویلیوں، چھوٹے قلعوں کے ساتھ ساتھ تسلسل کے ساتھ بیرونی دیواروں سے متصل کر دیا گیا۔ آج بیسویں صدی کا انسان بھی اپنا گھر بناتے وقت بیرونی چار دیواری ضرور بناتا ہے۔ ایسی دیواروں میں دیوار چین جو ۱۵۰۰ میل لمبی اور معائنہ کے لئے مینار ہے۔ جس کا مینار ہیں اور ۲۰۰ گز ر

پر محیط ستانے کی جگہیں اور ۴۰ فٹ اس کی اونچائی ہے[92]۔

پاکستان میں مختلف جگہوں پر مختلف انواع قسم کی تعمیرات کی گئی ہیں جو عظمت کے انداز اور علاقائی اعتبار پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں مسلمانوں سے قبل جو آبادیاں قائم ہوئیں۔ ان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب، ٹیکسلا اور ہندوشاہی تعمیرات شامل ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کی آمد کے بعد محمد بن قاسم، محمود غزنوی، عہد سلاطین اور مغل دور میں جو حصار قائم کیے گئے۔ تیسری مثال برطانوی دور اور سکھوں کے دور میں آبادیوں کے گرد بننے والی چاردیواریاں شامل ہیں۔

پاکستان موئن جوڈارو ہڑپہ اور ٹیکسلا ایسے شہر ہیں جن کے گرداگرد چاردیواری فصیل قائم کی گئی۔ موئن جوڈارو اور ہڑپہ میں دھوپ اور بھٹی میں پکائی گئی اینٹیں استعمال ہوئیں جبکہ ٹیکسلا میں مقامی چھوٹے بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے۔ ان چار دیواروں میں داخلی دروازے بھی ہوتے جیسا کہ آج ہم دیکھتے ہیں قلعے ایک عظیم الشان داخلی محرابی دروازہ اور دیواروں میں دشمن پر پانی پھینکنے کے لئے سوراخ، دیواروں پر گولے برسانے والی جگہیں، اور دشمن پر بندوق سے فائرنگ کرنے کی جگہیں بنی ہوتی ہیں جو عہد وسطیٰ کی بہترین مثالیں ہیں[93]۔ یہ ابتدائی مسلم دور میں بھی موجود تھیں۔ اسلام سے قبل برصغیر یا یورپ میں اس کی تاریخ نہیں ملتی، دفاعی نقطہ نگاہ سے یہ چاردیواری جس میں جابجا برج گولائی دار یا مستطیل اور نیم گولائی دار یا کثیر اضلاع والے برج بنائے جاتے ہیں جس سے ایک طرف تو چاردیواری کی خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوتا دوسری طرف یہ برج دیواری کو مزید مضبوطی مہیا کرتے۔ قلعہ عمومی طور پر عوام الناس کے لئے رہائشی مقاصد کے لئے استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ یہاں ہنگامی حالات کے تحت لوگ آباد ہوتے جب کہ شہر دشمن کی زد میں ہوتا۔ اپنی تعمیراتی اہمیت کے پیش نظر قلعہ کی دیواریں بہت اونچی ہوتیں اور اسی حساب سے داخلی دروازے بنوائے جاتے اور فوجی دستوں کے لئے بیرکیں بنائی جاتیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بعد میں ہندوستان میں مغلوں نے اپنے لئے قلعے بنوائے جو فوجی مقاصد کے لئے کبھی استعمال نہ کئے گئے بلکہ وہ زیادہ تر شاہی محلات کے طور پر استعمال کئے گئے یا مغلوں نے وہاں اپنے دربار سجائے۔ یہ بھی حقیقت ہے یہ قلعے زمانہ امن میں بنائے گئے تا کہ ہنرمندوں کو روزگار میسر آ سکے اور بناتے وقت ان کے ذہن میں اپنی حفاظت یا شاید ہنگامی حالات کے دوران بادشاہ کی حفاظت ہوگی۔

فوجی نقطہ نگاہ سے تعمیر ہونے والے قلعوں میں زیادہ تر قلعے نویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر ۱۲ ویں صدی عیسویں تک بنائے گئے ان میں زیادہ تر شام اور مصر میں عیسائیوں کے دور کے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عیسائیوں نے شام اور مصر کے چھوٹے قلعوں سے فن تعمیر کو مستعار لیا اور اس پر مستزاد یہ کو اہل یورپ نے بھی اپنے قلعوں میں دشمن پر کھولتا ہوا تیل تیروں کی بوچھاڑ پانی ڈالنے کے لئے رکھی جانے والی جگہوں کا استعمال مسلمانوں سے ہی لیا۔ پاکستان میں ایسا قلعہ رہتاس میں موجود ہے اور یہ اس نوعیت کی برصغیر میں غالباً پہلی مثال ہے۔ قلعہ کا نقشہ ہندوستان اور یورپ میں مختلف ہے یہ اپنے ملک کے جنگی حالات کو مدنظر رکھ کر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جگہ کی فراوانی تھی اور یہاں مختلف نوعیت کے متعدد قلعے تعمیر کیے گئے۔

برصغیر میں مسلمانوں نے قلعوں کے بڑے داخلی محرابی دروازے متعارف کروائے جن سے ہاتھی مع عماری کے گزر سکتا تھا۔ مسلمانوں سے قبل کے دروازے مستطیل ہوا کرتے تھے اور ان کی محراب نہ ہوتی تھی اور یہ آسمان کی طرف کھلتے تھے۔ جبکہ زمانہ جنگ میں یہی ہاتھی ان دروازوں کو توڑنے کا کام کرتے جو امن کی حالت میں باربرداری کے لئے استعمال ہوتے جبکہ مشرق وسطیٰ میں ہاتھیوں کے استعمال کی نشاندہی کم ہی ملتی ہے اور اگر ملتی ہے تو اس جنگ میں ہاتھی صرف ہندوستان سے منگوائے گئے ہوں گے۔ مسلمانوں نے مضبوط اور ٹھوس دیواروں کو متعارف کرایا جو دفاع کی مضبوطی کا باعث بنیں۔ ہندوؤں کا فرض تھا کہ وہ چار دیواری کے اندر لکڑی

مہیا کریں جو ایندھن کا کام دے۔ یورپ اور برصغیر میں مسلمانوں نے جو دروازے متعارف کرائے ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوہری محرابوں والے تھے جبکہ دوسری خوبی جو شام اور مصر سے لی گئی۔ وہ متوازی الاضلاع داخلی راستہ دیواروں کے اندر ہوتا وہ اس لئے کہ قلعہ پر قبضہ کے بعد فوج جب صحن میں جمع ہوتو اس پر تیروں یا گولیوں کی بوچھاڑ کی جا سکے۔ یہ چور داخلی دروازے سب سے پہلے گول شہر بغداد میں آٹھویں صدی عیسوی میں استعمال ہوئے دوسری مرتبہ قاہرہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں ان کا استعمال دیکھنے میں آیا۔

ہندوستان میں چار دیواری میں آباد شہروں کے بعض داخلی دروازے اوپر کی طرف کھلتے جو دیواروں کی اونچائی تک جاتے یہ عمومی طور پر کھلے صحن کی طرف کھلتے، آج کے دور میں برصغیر کے تمام قلعوں جو ہندو ادوار سے متعلق ہیں ان میں بھی مسلمانوں کے فن تعمیر کی خصوصیات موجود ہیں کیونکہ ہندوؤں کے فن تعمیر پر فاتح مسلمانوں کا اثر قدرتی امر ہے۔ زیادہ تر قلعے جو مسلمانوں نے بنوائے وہ شہر کی چار دیواری کے ساتھ تھے۔ جو پہلی دفاعی لائن کا کام دیتے شہر کی فتح کے بعد آبادی قلعہ میں چلی جاتی۔ اگرچہ ساری آبادی کو قلعہ میں نہیں رکھا جا سکتا تھا مگر ایسا کیا جاتا اور بعض لوگ وہاں سے ہجرت کر جاتے جبکہ عوام الناس کو وہاں سے بھاگنے کی اجازت دے دی جاتی۔ اور آخری جنگ قلعوں کے گرد لڑی جاتی اور لوگ اس فوج پر انحصار کرتے جو قلعہ کے اندر موجود ہوتی۔ یہ قلعے شہروں سے ذرا پرے حملہ آوروں کے راستے میں بنائے جاتے قلعہ کی دیواریں عمومی طور پر اونچی بنائی جاتیں اور ڈھلوانی شکل میں چوڑی اور مضبوط ہوتیں۔ دروازے محرابوں سے مزین ہوتے اور ان میں مضبوط دروازے ہوتے ہیں جن کے درمیان لوہے کی بڑی بڑی میخیں ہاتھیوں کے حملوں سے بچاؤ کے لئے لگی ہوتیں۔ قلعہ کے داخلی دروازے کے اندرونی اطراف حفاظتی دستوں کے لئے کمرے بنائے جاتے۔ دیواروں کے اوپر تیروں کی بوچھاڑ کے

لئے مخصوص جگہیں بنائی جاتیں جہاں سے پانی یا کھولتا ہوا تیل ڈالنے کی مخصوص جگہیں اور بھاری توپخانے کے لئے الگ جگہیں مخصوص کی جاتیں۔ دیواروں کے اندر جابجا راستے بنائے جاتے۔ جن کی چھتیں محراب دار ہوتیں۔ بعض اوقات یہ راستے میں بھی بنائی جاتیں جن سے ان سپاہیوں کی حفاظت مزید ممکن ہو جاتی جو میدان جنگ میں ہوتے۔ اس کے علاوہ قلعہ کے ملازمین کے لئے رہائشی مکان بھی بنائے جاتے۔ نقار خانے اور بارود خانے بنائے جاتے۔ پیغام رسائی کے لئے کبوتر خانہ ملٹری بینڈ شعبہ جاسوسی قائم کیے جاتے۔ بعض قلعوں کی دیواروں ۴۰ فٹ تک چوڑی بنائی جاتیں۔ اس کے نتیجہ میں سیڑھی اور رسی سے دیوار پھاندنے کا طریقہ وجود میں آیا۔ نیچے سے چوڑی اوپر سے پتلی دیواریں ٹھوس بنیاد کا ذریعہ ہوتیں ایک اور چیز جو دیواروں کی بناوٹ میں استعمال ہوئی وہ حملہ آوروں کے خلاف آگ سے حملہ کرنے کا طریقہ دشمن پر فتح کے لئے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ طریقہ ہم مسلمانوں کے قلعوں میں یورپ اور ہندوستان میں دیکھتے ہیں اس میں دیواروں آڑی ترچھی Zig Zag بنائی جاتیں۔ اس سے اگلا اصول یہ ہوتا کہ دروازے کو اچانک بنایا جاتا جو بظاہر آڑی ترچھی دیوار میں گم ہو جاتا جس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو وہاں تک پہنچنا انتہائی دشوار ہوتا دوسرا اور دشمن پر آگ کے گولے پھینکنے میں مدد معاون ثابت ہوتا۔ اس طرح ایک دروازہ کو فتح کرنے کے لئے حملہ آوروں کو جو محنت کرنا پڑتی ویسی ہی محنت اگلے دروازے کو فتح کرنے کے لئے کرنی پڑتی۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ ہر کوئی با آسانی قلعہ فتح کرے۔ مسلمانوں سے قبل داخلی دروازے مستطیل ہوتے جبکہ محرابی دروازے ہندوستان اور یورپ میں رواج پذیر نہ تھے۔ ہندوستانی چٹانوں سے ایسے دروازے تراشتے ان کے شہروں کی چار دیواری مسلمانوں کے فن تعمیر سے یکسر مختلف ہوتی۔ ابتدائی ہندوستانی فن تعمیر میں لکڑی کا کام اور پکائی گئی اینٹیں استعمال ہوتیں یہ اشوک اور پارتھین دور کا خاصہ ہے کہ جب پتھر پہلی مرتبہ استعمال ہوئے مگر تب بھی محراب کوئی نہ تھی۔ یہ داخلی

دروازے جو آج ہم دیکھتے مکمل طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ مسٹر ہیول نے اسے سارا سینک (Sara Cenic Archecture) کا نام دیا۔ آج ہم جو راجپوتوں کے قلعے دیکھتے ہیں وہ اسی فن تعمیر کا خاصہ ہیں۔ جس کی مثال بہاولپور میں قلعہ دراوڑ ہے یہ قلعہ راجپوتوں کا تعمیر کردہ ہے۔

۱۳ویں صدی عیسوی کے وسط میں مقامی لوگ گن پاؤڈر سے واقف ہوئے اس ایجاد سے چاردیواری کے اندر آبادی اور قلعوں کے فن تعمیر پر اثرات اور قلعوں کو مزید مضبوطی سے بنایا جانے لگا۔ اوران جگہوں پر جہاں رہائش نہیں تھی نئے قلعے بنائے گئے جو حملہ آوروں کے راستہ میں ہے۔ آج بھی پاکستان میں قلعہ اٹک، پھروالا قلعہ اور قلعہ رہتاس ایسے فن تعمیر کی نادر مثالیں ہیں۔ جبکہ لاہور دہلی آگرہ کے قلعے ایسی جگہوں کے قریب بنائے گئے جہاں پہلے ہی سے آبادی موجود تھی۔ ان قلعوں کو چھوٹے قلعے کہنا مناسب ہوگا چہ جائیکہ قلعہ اٹک پھروالا اور رہتاس جو خالصتاً جنگی اور دفاعی حکمت عملی کے طور پر بنائے گئے[94]۔

ہم مسلمانوں کے دور کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ محمد بن قاسم کے دور میں سے محمود غزنوی کے دور تک برصغیر میں پہلے ہی متعدد قلعے موجود تھے۔ پھروالا قلعہ کی صحیح تاریخ بنا ۱۰۰۲ء ہے۔ محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک پرانے قلعوں کو ہی مضبوط بنایا گیا مگر کوئی قابل ذکر فن تعمیر کے لحاظ سے کارنامہ شاذ ہی میسر آتا ہے۔ اس سلسلے میں مضبوط حوالہ ہمیں پٹھانوں کے دور سے میسر آتا ہے۔ زمانہ تغلق میں خاندان غلاماں اور خلجیوں کے فن تعمیر کی خصوصیات ملتی ہیں جن پر ہندووانہ اثرات غالب ہیں۔ ہم عادل آباد میں دوہری دیوار پہلی مرتبہ ۱۳۲۷ء دیکھتے ہیں۔ جو رائے پتھورا کی حویلی کی دیوار تھی۔

بیرونی چاردیواری سے مرصع شہر:

ہیون سانگ کا ویہند جو اور بہت سے مختلف ناموں سے پہچانا جاتا ہے آج کا یہ قصبہ حضرو کے بالمقابل وادی چلاس دریائے سندھ کے دائیں کنارے دریائے کابل

سے ۱۶ میل کے فاصلے پر ہے جہاں دریائے کابل دریائے سندھ سے ملتا ہے اس قصبے کے گرداگرد ۲۰ فٹ اونچی دیواریں ہیں آج کل آثار کی شکل میں ہیں ان دیواروں میں چار دروازے ہیں جن کی کوئی محراب نہیں ہے۔ یہ دیواریں بھٹی کی پکی ہوئی اینٹوں سے بنائی گئی ہیں مگر نیچے بنیادوں میں چوکور پتھر لگائے گئے ہیں۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ نیچے کا میٹریل مسلمانوں سے پہلے کا ہے۔ دروازے کا پٹ ایک ہی ہے۔ یہ جگہ محمود غزنوی کے حملہ کے وقت سردیوں میں ہندوشاہی دور کا دارالخلافہ تھی جس نے بہت سی جنگوں کا نظارہ کیا ہے۔ یہ ہندوفوجی نقطہ نگاہ سے تعمیر کی پہلی مثال ہے اس دیوار میں بہت سے برج بنائے گئے ہیں۔ جو ۵۰ گز کے فاصلے پر ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ یہ دیوار محمود غزنوی کے دور میں دوبارہ تعمیر کی گئی۔

سرکپ کے نام سے رہائشی کالونی ٹیکسلا کے قریب ہے۔ موجودہ کھدائی شدہ جگہ سیتھو پارتھین دور کا شہر تھا۔ جوکئی مرتبہ اس قصبہ کے گرد ۲۱ فٹ بلند دیوار موجود ہے جو برجوں سے مکمل کی گئی ہے۔ اس قصبہ میں محلات مندر اور عام لوگوں کے رہنے کے مکانات موجود ہیں۔ جن کے دروازے بازار کی طرف کھلتے ہیں۔ یہ برج مستطیل بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح کی چار دیواری والے قصبوں میں ڈیجی والی ٹکری (خیر پور میرس) اور موئن جوڈارو اور ہڑپہ آج بھی گواہ ہیں۔

قصر:

یہ محلات اسلام سے قبل برصغیر اور یورپ میں بنائے جاتے۔ رومنوں اور گائیتھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں ایسے محلات تعمیر کیے البیرونی نے ہندوستان میں ایک ایسے قصر کی تعریف کی ہے جو کابل اور دریائے سندھ کے قریب واقع تھا۔ قصر امراء کے رہنے کی جگہ کو کہا گیا ہے۔ ہنگامی حالات کے موقع پر ایک چھوٹی پلٹن اس کی حفاظت پر مامور ہوتی۔ عربوں نے بھی ایسے محلات بنائے۔ یہ محلات عمومی طور پر تاریخ میں بند مکان کے طور پر بنائے جاتے ہیں۔

پاکستان میں ایسے محلات کی دوسری مثال قصر نواب سید خان جو پشاور کے نزدیک ہیں اس کی دیواریں ۱۴ افٹ تک چوڑی ہیں جو پختہ مٹی کی ٹائلوں سے بنائی گئی ہیں۔

رباط:

یہ مختلف نوعیت کے چھوٹے قلعہ نما چوکیاں ہیں جو شام اور سسلی میں موجود ہیں اوراس کی مثالیں ہمیں مسلمانوں کے دور میں برصغیر میں بھی ملتی ہیں۔ برصغیر میں اس کی بہترین مثال قلعہ روات ہے۔ جہاں گکھڑ سلطان سارنگ خان کا مقبرہ ہے جو شیر شاہ سوری سے جنگ کے دوران مارا گیا تھاں یہ رباط کی ایک عمدہ مثال ہے۔

رباط ایک اونچی چار دیواری سے گھری ہوئی عمارت جس کی دیواریں ۳۰ فٹ تک اونچی ہوسکتی ہیں ایک بڑے دروازے کے ساتھ ہوتی ہے جہاں سے آمد ورفت پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ ان کا ایک دروازہ ہوتا ہے اوراس سے ملحق چند مکانات ہوتے ہیں جو مکانات سے زیادہ بیرکوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں مغربی کونے میں ایک مسجد ہے سارنگ خان کا مقبرہ شمال مغربی کونہ میں ہے۔ ایسی رباط دو قلعوں کے درمیان درجنوں کے حساب سے تعمیر کی جاتیں جو ڈاک چوکیوں کا کام بھی دیتیں۔

قلعے:

شمال مغربی سرحد پر سکھوں اور برطانوی سامراج نے چند قلعے بنائے ان میں میکن فورٹ: شگئی فورٹ۔ علی مسجد فورٹ۔ لنڈی کوتل فورٹ۔ اکوڑہ فورٹ یہ تمام قلعے مغربی طرز تعمیر کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے۔ جن میں سے اکثر جمرود اور خیبر روڈ پر واقع ہیں۔ یہ خیبر پاس کی حفاظت کے لئے بنائے گئے۔ پشاور میں قلعہ بالا حصار پنجاب میں قلعہ اٹک، پھروالا قلعہ، قلعہ روہتاس، قلعہ لاہور، قلعہ شیخوپورہ، قلعہ ملتان، قلعہ دیپالپور، قلعہ سیالکوٹ، قلعہ دراوڑ۔ مشہور قلعے ہیں۔

قلعہ روہتاس
(1543ء)

جرنیلی سڑک پر سفر کرتے ہوئے جب آپ دینہ پہنچیں تو کچھ فاصلے پر سڑک جنوب مشرق میں ایک قلعہ کے باقیات دکھائی دیں گے یہ عظیم قلعہ مغربی پاکستان میں شیرشاہ سوری کے زمانے کی بچ جانے والی عمارتوں میں سب سے اہم ہے۔

۱۵۳۹ء میں نصیرالدین ہمایوں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ اسی سال ایک مہم جو شیرشاہ سوری کے نام سے آگے آیا جس نے ہمایوں سے تخت چھین کر سوری خاندان کی حکومت کا آغاز کیا۔ اس کی حکومت مختصر مگر بےنظیر تھی اس نے زندگی کے مختصر حصے میں بڑی کامیابی حاصل کی شیرشاہ سوری نے دہلی اور پنجاب میں بہت سے اہم تعمیراتی کام کیئے بدقسمتی سے وہ زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا اور جلد ہی فوت ہوا۔ اور سہسرام بہار میں دفن ہوا[95]۔

کچھ حد تک ہجرت کر جانے والوں کو واپس بلانے کے لئے اور کچھ مہاجروں کی قریبی طاقت سے مدد کرنے والے ہنگامہ خیز گھکھڑوں کو قابو کرنے کے لئے سلسلہ کوہ نمک کے شمال میں شیرشاہ سوری نے روہتاس کا قلعہ تعمیر کیا اور اس میں بارہ سو افراد کی ایک محافظ فوج ایک ساتھی جنگجو خواص خان کے ماتحت تعینات کر دی اس قلعہ کے علاوہ مغربی بہار میں ایک اور قلعہ رہتاس موجود ہے جو ۱۵۳۹ء میں مقامی ہندو حکمرانوں پر شیرشاہ سوری کی فتح کا نشان ہے۔

جہلم کے قریب اس قلعہ کی تعمیر کے لئے جگہ جہلم سے بارہ میل شمال مغرب میں کیہاں ندی پر واقع ایک بلند پہاڑی چنی گئی پر گکھڑوں کو خوفزدہ رکھنے کے لئے اور کابل



روہتاس فورٹ



بالا حصار فورٹ



ملتانی گیٹ (لالو الا گیٹ)



شاہی قلعہ لاہور



قلعہ دراوڑ

سے لاہور آنے والے راستے پر واقع تھا۔

گکھڑ مغلوں کے دوست تھے جس کی وجہ سے قلعہ کی تعمیر کو روکنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتے جیسا کہ معماروں کا بائیکاٹ قابل ذکر ہے یہ طریقہ کسی کو کام پر آنے سے روکنے کے لئے مفید تھا شیر شاہ کو ایک مختصر وقت کے لئے ایک اشرفی (ایک سونے کا مہرہ) کے عوض کام کی پیش کش کرنا پڑی ۱۵۴۳ء میں ہر لائے گئے پتھر کے عوض پر کام شروع کر کے چار ملین روپے کی لاگت سے مکمل ہوا جب گکھڑوں کو احساس ہوا کہ ان کی کوششوں کے باوجود قلعہ تعمیر ہو گیا ہے تو انہوں نے ایک کمزور انداز میں اس قلعہ کا ایک ہمسر قلعہ سلطان پور کے قریب تعمیر کر کے جواب دیا اور آج اس کی ایک غیر مہذب اور ناہموار عمارت ہی بچی ہے عظیم جرنیلی سڑک شیر شاہ سوری نے ہی تعمیر کی لیکن اس تعمیر سے پہلے ہی روہتاس لاہور سے پشاور جانے والی سڑک پر واقع تھا ان پرانی سڑکوں کے آثار پہاڑی علاقوں کے درمیان کے سلسلہ کوہ نمک شمال اور جنوب میں میدانوں تک ہیں یہ آثار مغل سرائے کے باقیات یا قلعہ کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر واقع ایک سرائے میں موجود ہیں اگر یہ آثار تاریخ کے حادثات کا شکار نہ ہو چکے ہوتے تو یہ مضبوط تعمیر کردہ عمارات برصغیر کی مغربی فوجی چوکی کی حیثیت سے اہم کردار ادا کر سکتی تھیں کبھی اس کی شہرت کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس نے شہنشاہ جہانگیر کو جب وہ وہاں قیام پذیر ہوا تھا کچھ مخصوص قسم کے تیر مہیا کیے تھے اور جہانگیر نے کئی بار وہاں قیام کیا تھا[96]۔ شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد ہمایوں اگلے پندرہ برس تک حکومت کرنے کے لئے جلد واپس آ گیا مغل حکومت جلد ہی ایران سے آسام تک پھیل گئی اور روہتاس ناقابل استعمال ہو گیا۔

عمارتی خصوصیات

قلعہ کا احاطہ تقریباً اڑھائی میل ہے اور ایک بیرونی دیوار تقریباً آدھا میل لمبی ہے۔ دیواریں اپنی بنیاد پر تیس فٹ چوڑی اور تیس سے پچاس فٹ بلند ہیں اس میں

ارسٹھ برج جہاں بارہ گزرگاہیں ہیں اور دیواروں میں بندوقوں اور تیروں کے لئے روزن اور یہاں توپوں کے لئے سوراخ ہیں منڈیر پر راستے کے نزدیک خفیہ ٹھکانے ہیں جن میں سے پگھلا ہوا سیسہ اور ابلتا ہوا پانی حملہ آوروں پر انڈیلا جا سکتا تھا قلعہ کا کبھی بھی محاصرہ نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ دروازے اندر پہنچنے کے لئے تعمیر کئے گئے تھے اب اس کے مختلف حصے کھنڈرات بن چکے ہیں خاص طور پر شمال کی طرف سے جہاں دیواروں کا ایک بڑا حصہ گر چکا ہے دوسری جگہوں پر نرم سرخ پتھروں کی بنیادیں فرسودہ ہو چکی ہیں دیوارں کو صرف عمدہ تعمیراتی سامان کے سہارے چھوڑ دیا گیا جس سے وہ تعمیر کی گئی ہیں شمال مغربی اور مشرقی گزرگاہ کے ساتھ مستطیل نما ڈیزائن کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے یہ گزرگاہیں بیس فٹ اونچی اور محرابی ہیں اور ابھی تک موجود ہیں جبکہ ان کے بڑے بڑے حصے کافی عرصے سے غائب ہو چکے ہیں تاہم ابھی تک بہت سے راستے استعمال کے لئے اپنائے ہوئے ہیں سب سے بہتر گزرگاہ سہیل دروازہ جو کہ ستر فٹ بلند اور ٹلہ جوگیاں کی سمت میں ہے اس دروازے کی بیرونی دیواروں پر چھوٹے چھوٹے کمرے موجود ہیں۔ یہ ساری گزرگاہ مکمل ہے جو استعمال ہونے کے باوجود قائم ہے اس کا بالائی حصہ اب ایک میوزم ہے۔ دیوار پر مختلف نقش و نگار ہیں جو اتنے اہم نہیں ہیں۔ سہیل دروازے کے علاوہ اور گزرگاہ خواص خوانی گیٹ ہے یہاں جہلم سے قلعہ میں راستہ داخل ہوتا ہے قلعہ کا شمالی حصہ ایک اندرونی دیوار کے ذریعے سارے قلعہ سے علیحدہ ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ بیرونی جانب سے جو ایک شہر پناہ کی قسم ہے اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی بلند عمارت بے محل شباہت کی ہے کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں یہ راجہ مان سنگھ نے بنائی تھی قلعہ میں دو باؤلیاں شامل ہیں۔ باؤلی کی سیڑھیوں کے ساتھ اسی زمانے کی ایک چھوٹی مسجد ہے۔

یہاں قابل بیان تعمیراتی خدوخال گزرگاہیں ہیں یہ عمدہ ماہرین تعمیر کروائی گئیں ہیں اور محرابی طور پر جن میں لمبے محرابی گوشے رکھے گئے ہیں جو کہ کھڑکیوں کے پہلو میں

واقع ہیں کھڑکیاں ہندوانہ قوسین پر تعمیر کی گئی ہیں تمام مشترکہ تعمیر میں مضبوطی اور شان کے ساتھ ایک شائستگی ہے جو کہ پٹھان فن تعمیر میں مہارت کو واضح کرتی ہے ایک ڈیڑھ صدی قبل تک قلعہ کے بیرونی جانب اس وقت رہائشی عمارات تعمیر نہیں کی گئی تھیں[97]۔ تاہم قلعہ کے شمالی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں بن گیا۔ ۱۹۴۷ء کی پریشانیوں میں اس کا ایک بڑا حصہ ٹوٹ گیا اور اب ملبے کا ایک ڈھیر بنا پڑا ہے۔ دیواریں حفاظتی کے نقطہ نظر سے ایک بہترین حالت میں ہیں وہ متوازی بلند ہونے والی متعدد سیڑھیوں کے ساتھ بلند ہوتی ہیں جن کے ذریعے افواج مختصر وقت میں ایک خطرناک مقام سے دوسری جگہ پہنچ سکتی تھیں دیواروں کا بیرونی حصہ مختلف جگہوں سے ٹوٹ چکا ہے۔

روہتاس کا بہترین نظارہ دریائے کیہان کی شمال جانب سے کیا جا سکتا ہے آج روہتاس ایک لمبی سیاہ رنگ کی دیواروں کی ایک لکیر کی طرح دکھائی دیتا ہے جو کہ زرد رنگ کے سرخ پتھر کے مخالف سمت میں کھڑی ہے جس کے پاس سے قدیم شاہراہ گزرتی ہے اس مقام پر وسیع انداز میں رقم اور افرادی قوت خرچ کی گئی ہے اور قلعہ کی عمار وسائل کے ناقابل یقین خرچ کی غیر معمولی مثال پیش کرتی ہے جس کا انسان نے چاہتے نا چاہتے ہوئے تاریخ کے ایک حصے تک خرچ اٹھایا جو کہ جلد ہی فوجی اعتبار سے بے فائدہ ثابت ہو گیا اور بالکل ایسا ہی آج تک ہو رہا ہے۔ جیسا کہ اسی مضبوط قلعہ سے فائدہ کی توقع تھی انہیں حاصل نہیں ہوا شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد جب ہمایوں جلاوطنی سے واپس آیا تو روہتاس کا گورنر قلعہ تاتار خان موسیٰ قلعہ کی کافی مضبوطی کے باوجود اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ گیا۔

اکبر نے کابل جاتے ہوئے روہتاس میں ایک رات گزاری اس کا بیٹا جہانگیر جو پہلے اس پر حکومت کر چکا تھا ادھر اکثر آتا رہتا تھا اور وہاں اپنا دربار لگاتا تھا وہ اور اس کے نوکر چاکر وہاں موسمی خیموں میں رہتے تھے جب وہ کابل جاتے اور واپس آتے تھے لاہور قلعہ کی طرح روہتاس میں رہائشی کوارٹر نہیں تھے۔ دوسرے مغلوں کو روہتاس سے

کسی قسم کا فائدہ اٹھاتے نہیں دیکھا گیا۔

صرف مغلوں کا ایک دستہ اور ایک گورنر وہاں کابل کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے کے لئے یہاں رہتے تھے۔

قلعہ نندنہ (991ء)

قلعہ نندنہ دسویں صدی عیسوی سے متعلقہ ہے۔ جس کا رقبہ 45 کنال 16 مرلے ہے۔ یہ قلعہ چواسیدن شاہ سے 12 میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ نندنہ پاس اصل میں چواسیدن شاہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ایک تنگ پتھریلا راستہ قلعہ نندنہ کے آثار تک لے جاتا ہے جو 1500 فٹ تک بلند ہے۔ ابوریحان البیرونی نے یہیں سے زمین کا قطر ناپا تھا جو موجودہ قطر سے 43 فٹ کے فرق کے ساتھ تھا[98]۔ سراورل ستین ک مطابق یہ راستہ سکندر کی افواج نے بھی دریائے جہلم کو پار کرنے کے لئے اختیار کیا۔ جو اس نے جلال پور (بوکے فالیہ) سے پار کیا[99]۔ اور یہ علاقہ بھیم پال اور محمود غزنوی کی فوجوں 404ھ/1014ء میں میدان جنگ بنا۔ اس طرح محمود غزنوی کا قبضہ قلعہ نندنہ پر ہو گیا یہاں اس نے ساروغ کو کوتوال مقرر کیا۔ نندنہ قلعہ کا تاریخ میں 991 عیسوی میں ملتا ہے جب لاہور کے راجہ نے 999ء میں مشرق کی طرف سے حملہ کی کوشش کی 13ویں صدی کے شروع میں اس پر قمرالدین کرمانی کا قبضہ تھا جس سے جلال الدین خوارزمی نے قلعہ کا قبضہ لیا۔ جلال الدین خوارزمی کو چنگیز خان نے 1021ء میں دریائے سندھ کے کنارے شکست دی تو اس کے امیر ترتی کے زیر تسلط یہ قلعہ آیا۔ التمش کی فتوحات کے زمرہ میں بھی نندنہ قلعہ کا نام آتا ہے۔ التمش کے بیٹے محمود نے 1247ء میں کوہ نمک کے راجہ کو سزا دینے کے لئے حملہ کیا جو چنگیز خانی فوج کا ہمرکاب تھا اس کے بعد اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، اس دور میں یہاں مغلوں کا ایک باغ بھی تھا۔

اس قلعہ کی مسجد میں نماز کی جگہ اور صحن موجود ہے۔ اس کے آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پرانے آثار زیر تعمیر مسجد ہے یہاں مسجد پر ایک کتبے کا کچھ حصہ بھی ہے جو بہت مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تین آثار بدھ ستوپا کے بھی ہیں جو ساتویں یا آٹھویں صدی کے ہیں اور مسلمانوں کی قبریں مغربی ڈھلوان پر نمایاں ہیں جن پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔

پھروالہ قلعہ

راولپنڈی سے تقریباً چھ سات میل کے فاصلہ پر ایک سڑک کہوٹہ کی طرف جاتی ہے۔ علیوٹ سے مزید چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر پہاڑوں کے دامن میں گھاٹیوں اور نشیبی ڈھلوانوں میں گھرے ہوئے ریتلے اور پہاڑی پتھروں سے تعمیر شدہ پرانا قلعہ موجود ہے جو قلعہ پھروالا کے نام سے مشہور ہے کبھی یہ مشہور قلعہ گکھڑوں کا دارالحکومت رہا۔ جنہوں نے یہاں ۱۰۰۲ء سے ۱۷۶۵ء تک حکومت کی آخری حکمران نواب مقرب خان کو گجرات کے مقام پر اپنے ساتھیوں کی سازش سے سکھوں سے شکست ہوئی۔ ۱۰۰۲ھ تا ۱۵۶۲ء کا زمانہ ایسا بھی گزرا کہ گکھڑ بلاشرکت غیرے اس علاقہ کے حکمران تھے۔ قلعہ تک علیوٹ سے شمال کی جانب تقریباً پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اس راستہ سے قلعہ تک جانے کے لئے چند کلومیٹر پہاڑوں کے درمیان سے پیدل جانا پڑتا ہے پورے پہاڑی علاقہ میں خشک ندی نالے آتے ہیں۔ ان ندی نالوں میں پانی کا نام و نشان نہیں۔ گھنٹہ بھر کی مسافت کے بعد یہاں پہنچتے ہیں۔ جنوب کی جانب سے ہاتھی گیٹ تک جانے کے لئے ایک پہاڑی اور آبی گزرگاہ سے گزرنا پڑتا ہے کہوٹہ روڈ سے محمد محفوظ نشان حیدر چوک سے پختہ سڑک کے ذریعے بھی قلعہ پھروالا تک پہنچا جا سکتا ہے اس طرح سیدھے سیدان بھمبر تراڑ گڑھا سے ہوتے ہوئے ڈھوک باغ جوگیاں پہنچتے ہیں اور وہاں پہاڑی سے نیچے اتر کر دریائے سوان کو عبور کر کے چھوٹی سی پہاڑی پر

چڑھتے ہیں اور قلعہ پھروالا میں داخل ہوتے ہیں۔ دریائے سوان کے دونوں اطراف پہاڑیاں ہیں دریائے سوان سے گزرنے کے لئے بڑے بڑے پتھر سل کا کام دیتے ہیں۔ قلعہ کے اندر چالیس کے قریب خاندان رہتے ہیں جن کا تعلق کیانی قبیلہ سے ہے۔

قلعہ پھروالا اپنے قیام سے ہی اسلام کا گھوارہ بن گیا اور اسے یہ اعزاز بھی حاصل رہے گا کہ یہ برصغیر میں پہلا اسلامی قلعہ ہے۔ 1012ء میں قلعہ پھروالا کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ ممتاز صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش اور حضرت قطب شاہ نے اپنے قیام سے اس جگہ کو منور کیا۔ 1018 میں ممتاز حساب دان اور ماہر فلکیات ابوالفتح البیرونی نے قلعہ میں قیام کیا اور ملحقہ پہاڑیوں سے زمین کا قطر ناپا۔ 1208 میں شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی سے واپسی پر جب وہ 400 اونٹ خزانے کے ساتھ گکھڑوں کے علاقے سے گزرا تو فدائی خان گکھڑ نے اپنے 20 کمانڈوز کے ساتھ شب خون مار کر شہاب الدین غوری کو شہید کر ڈالا۔ غوری کے داماد قطب الدین ایبک نے قلعہ پھروالا پر حملہ کر کے گکھڑوں سے خوب بدلہ لیا۔

1524ء میں سلطان ظہیر الدین بابر نے قلعہ پھروالا پر حملہ کیا جس کا ذکر ''تزک بابری'' میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔ قلعے پر قبضے کے بعد بابر نے تاتار محل میں قیام کیا۔ بالآخر بابر اور گکھڑوں میں صلح ہوگئی اور یہاں سے مغلوں اور گکھڑوں میں ایسے لازوال اور برادرانہ تعلقات کا آغاز ہوا جو آخر دم تک قائم رہا۔

قلعہ میں کئی اولیاء نے قیام کیا جن میں حضرت شاہ چراغ بادشاہ حضرت چن بادشاہ آف پنڈوری کے بھائی بیان کئے جاتے ہیں جن کا مزار بھی یہاں ہے جہاں ۲۵ جون کو ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ ماضی میں قلعہ پھروالا سے دہلی لاہور اور ٹیکسلا کے راستے جاتے تھے۔ یہاں سید مرکلاں بادشاہ زوکھیا شریف نے بھی قیام کیا قلعہ کے اندر لاتعداد کمروں کی بنیادوں کے آثار ملتے ہیں جو بیرونی حملہ آوروں نے تہس نہس

کر دیئے ہیں۔ قلعہ کے چاروں اطراف آبی گزرگاہیں ہیں لیکن پانی کے انتظام کے لئے ہاتھی گیٹ کے قریب باؤلی کے آثار بھی ملتے ہیں قلعہ کے دروازے اور بیرونی دیواریں صحیح حالت میں ہیں۔ بعض مقامات پر دیواریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ دروازے شکستہ حالت میں ہیں بابر نے توزک بابری میں قلعہ پھروالا کی تعریف کی اور اسے مضبوط قلعہ قرار دیا۔ بابر کے بیٹوں مرزا عسکری اور مرزا کامران نے شیر شاہ سوری سے بھاگ کر اس قلعہ میں پناہ لی شہنشاہ ہمایوں نے یہاں پر ہی دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنے کا منصوبہ تیار کیا یہیں ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کی آنکھیں بیرم خان کے حکم پر بے نور ہوئیں۔ بعض مورخین کے نزدیک گکھڑ قبیلہ کے لوگ محمود غزنوی کے ساتھ یہاں آئے۔ پھروالا کا یہ عظیم الشان قلعہ سلطان گکھڑ شاہ نے ۱۰۰۲ء میں تعمیر کرایا جو ۱۷۵ ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے پہاڑیاں اور دریا قلعہ کے لئے قدرتی دفاع کا کام دیتے ہیں۔ قلعہ کی دیواریں ۲۵ سے ۳۰ فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی ہیں۔ دیواروں کے اوپر تیر اندازوں اور پہریداروں کے استعمال کے لئے درے بنے ہیں[100]۔

یہ قلعہ ساڑھے سات سو سال تک خطہ پوٹھوہار کی گکھڑ سلطنت کا دارالحکومت اور عظیم مذہبی اور فوجی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔

البیرونی نے اپنی کتاب الہند نے اس علاقہ کا نام نراہار لکھا ہے جو مارگلہ کے پیچھے واقع ہے یہ علاقہ جہاں پھروالہ قلعہ موجود ہے۔ چٹانوں پر مشتمل نرارا اتران پر واقع ہے۔ جبکہ دریائے سواں اسے اور بھی محفوظ رکھتا ہے یہ جگہ سطح سمندر سے 2531 فٹ بلند اور دریا سے 800 فٹ اوپر ہے۔ اس پہاڑی کے اوپر اس قلعہ کا نقشہ عمومی نہیں۔ اس کی 41 سمتیں ہیں جن میں چھوٹی اور لمبی دیواریں جو اچانک مڑ جاتی ہیں۔ جبکہ اس کی بیرونی دیوار 3-9 فٹ چوڑی ہے جو بھاری پتھروں سے قلعہ روات کی طرز پر بنائی گئی ہیں۔ جنھیں مضبوط بنانے کے لیے 13 عدد گول برج تعمیر کیے گئے ہیں[101]۔ ان میں لشکری گیٹ جو آج بھی محفوظ حالت میں ہے۔ یہ روات میں سرائے

کی دیوار کے گیٹ کی نقل ہے جو دو بڑے برجوں کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے یہ دوہرا گیٹ ہے جس کے اوپر محرابیں ہیں جو ان کمروں تک جاتی ہیں جہاں نگرانوں کو رہائش دی گئی تھی، اس کے ماتھے پر مختلف چوکٹھے بنا کر ان پر پلاسٹر کر دیا گیا ہے۔ اس کے گردا گرد 7.50 میل لمبی دیوار جو ہر طرف سے اوسطاً 1980، 1150 فٹ تک ہے۔ جبکہ اس کی بیرونی چار دیواری کھردی اور اوپر نیچے ہے اور جنوب کی طرف سے شمال کی نسبت اونچی ہے لشکری دروازے کے اوپر رہائش بنا دی گئی ہے۔

بیرونی چار دیواری کا اندرونی علاقہ کھردرا ہے جو جنوبی طرف سے شمال کی نسبت قدرے اونچا ہے لشکری دروازے کے قریب رہائش بنائی گئی ہیں دریا کے پار ساڑھے چار 57'6"x - 64 فٹ کے ایک احاطے میں مقابر ہیں جو ہشت پہلو ہیں اور 8'-6" کی ایک گذرگاہ جنوب کی جانب ہے۔ اسی جانب ایک پرانی مسجد 44'-6"x22'-6" سائز کی موجود ہے۔ یہ مقبرہ کسی گکھڑ سردار کا بتایا جاتا ہے۔ اسی قلعہ کے بارے سب سے پہلے بابر نے اپنی توزک میں لکھا کہ اس جگہ وہ 1519ء میں آیا تھا۔

پھروالہ سے مراد اونچا یعنی گہری وادی میں اونچا قلعہ اس قلعہ کو دو سڑکیں جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جنوب مشرق کی طرف ہے۔ یہ سڑک اس قلعہ کے آثار کے کنارے کنارے واقع ہے آدھ کوس جانے کے بعد یہ سڑک مشکل صورتحال پیدا کرتی ہے اور یہ قلعہ کے داخلی دروازے تک جاتی ہے۔ اس راستہ سے صرف اکیلا آدمی ہی بمشکل تمام گزر سکتا ہے دوسری سڑک شمال مغربی راستے پر ہے یہ راستہ کھلی وادی طرف سے قلعہ پہنچتا ہے اس کے ساتھ ان دونوں سڑکوں کے علاوہ قلعہ تک کو راستہ نہیں پہنچتا۔ اگرچہ یہ جگہ نہ تو کبھی میدان جنگ میں ہے مگر یہ قلعہ جس مقام پر موجود ہے اس بارے میں بھی سوچا نہیں جا سکتا کہ یہ ایسی عمودی اونچائی پر ہے۔

175 ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے اس قلعے کی تعمیر کا آغاز 1002 میں پہلے فرمانروا معروف گکھڑ شاہ نے کیا۔ محل وقوع کا چناؤ دفاعی نقطہ نظر سے ایک موزوں اور دشوار

گزار پہاڑی سلسلہ پر کیا۔ قلعہ کے شمال کی جانب سر بلند پہاڑی سلسلہ ہے۔ جنوبی اور مشرقی جانب خطرناک زمینی ڈھلوان ہے اور مغربی جانب دریائے سوان بہتا ہے۔ قلعہ چاروں جانب 25 فٹ اونچی اور 10 فٹ چوڑی دیوار سے محفوظ تھا کہ جس میں تیر انداز اور پہرہ داروں کے استعمال کے درے بنے ہوئے تھے۔ قلعہ کے چھ داخلی دروازے ہیں۔ ہاتھی دروازہ ہاتھیوں اور گھڑ سوار دستوں کی نقل وحرکت کے لئے، لشکری دروازہ، لشکر اور حملہ آوروں کے استعمال کے لیے، زیارت دروازہ، جس جانب آباد اجداد کی قبریں واقع ہیں۔ بیگم دروازہ، خواتین کے استعمال کے لئے، باغ دروازہ، جس جانب کبھی انتہائی دلفریب بیرونی حملہ آور کے اچانک حملے کی اطلاع کے لئے موثر انتظام موجود تھا۔ نقار خانے سے ملحقہ پانی کے ذخیرے کے نشانات بھی واضح نظر آتے ہیں اس کے علاوہ تاتار خان کے محل کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ قلعہ میں رہائش پذیر حکمران گکھڑ خاندان کے علاوہ 50 ہاتھی، 200 گھوڑے اور 500 نفوس پر مشتمل تازہ دم پیادہ فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ باقی آبادی ایک بڑے قصبے کی صورت میں تقریباً 400 گھروں پر مشتمل تھی جو قلعے سے باہر رہائش پذیر تھی۔ دریائے سوان کے جنوبی جانب قدیمی مسجد کے ساتھ سلطان آدم خان ومارا خان کی قبروں کے علاوہ خطہ پوٹھوہار کے آخری فرمانروا سلطان مقرب خان کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ اس کے علاوہ پانچ سے 10 ایکٹر پر پھیلے ہوئے قبرستان بھی تھے کہ جن کا ریکارڈ ابھی بھی ریونیو کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ قلعہ پھروالا کے مکینوں اور اس کے درودیوار کے ساڑھے سات سو سالہ دور حکومت میں زمانے کے نشیب وفراز دیکھے۔ خطہ میں جب بھی کوئی شورش برپا ہوتی تو گکھڑ فوج قلعہ پھروالا سے آندھی وطوفان کی طرح اُٹھتی اور دشمن کو نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر روانہ رکھتی اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ دشمن فوج قلعے پر چڑھ دوڑتی اور ملیامیٹ کر ڈالتی۔ کبھی خوشیوں کے شادیانے بجتے اور کبھی قلعہ پھروالا کی دیواروں سے لہو ٹپکتا۔

قلعہ دراوڑ

(843ء)

اس قلعہ کا اصل نام قلعہ ڈیوراول فورٹ ہے جو اس کے بانی کے نام پر ہے۔ یہ قلعہ بھَٹی راجپوت خاندان کے موزاج اور دیوراج نے ۸۴۳ء میں بنانے کا حکم دیا۔ راجپوت خاندان کی تاریخ دیوراج کے دادا تنو سے شروع ہوتی ہے جو بجی رائے کا بیٹا تھا۔ تنو کے پانچ بیٹے تھے۔ تنو نے ۷۵۷ء میں بجنوٹ قلعہ کی تعمیر کی اس کے پوتے نے دیوگڑھ یا دیوراول میں مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ آج قلعہ کی جو شکل ہے وہ اصل نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ایک مضبوط قلعہ ہے جو ٹیلے اور چاردیواری سے گھری آبادی کے ساتھ واقع ہے۔ چولستان میں قلعہ دراوڑ ایک خوبصورت عمارت ہے اس کے عظیم الشان برج ریت کے سمندر میں لنگر کی طرح پڑے ہیں یہ فوجی فن تعمیر کا ایک عظیم الشان شاہکار ہے جو اوائل اٹھارویں صدی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ آج بھی بہاولپور کے نوابین کی ملکیت ہے۔ جنہوں نے اس علاقے میں اپنے آپ کو محدود رکھا۔ اور دراوڑ کو اپنی حکومت کی بنیادی آماجگاہ بنایا۔ موجودہ قلعہ پرانی بنیادوں پر کھڑا ہیں جو روایات کے مطابق اسلام سے پہلے کا ہے روایات کے مطابق اسے بھٹی یا بھاٹیہ حکمران ڈیرہ سدھ نے بنوایا جسے ڈیوراول کہا جاتا تھا نام بعد میں بگڑ کر دراوڑ بن گیا۔ جب یہ قلعہ بنایا گیا تو اس کے ۵۶ برج تھیں جو دیورانے خود بنوائی اس نے دو جھیلیں بنوائیں۔ دوسری جھیل ٹنوٹ کے مقام پر ہے۔ ان جھیلوں کے نام اس نے خود رکھے ایک نام تنوسر اور دوسری کا نام دیوسر۔ بھٹی راجپوت علاؤالدین غوری کے ہاتھوں ختم ہوئے اس وقت سے آج تک یہ قلعہ مسلمانوں کے زیر تسلط رہا جنہوں نے اس قلعہ کو موجودہ شکل دی[102]۔

پنجاب کے جنوب مشرقی علاقے جس میں تین اضلاع ہیں۔ بہاولنگر، بہاولپور اور رحیم یار خان جن کا رقبہ 26,617 مربع کلومیٹر ہے اس رقبے کا آ... ریگزار ہر

مشتمل ہے جو چولستان کے نام سے جانا جاتا ہے اور عمومی طور پر اس علاقہ کو روہی کہا گیا ہے پرانے وقت میں چولستان کا موسم آج کے موسم سے مکمل طور پر مختلف تھا اس قلعے کے علاوہ چولستان میں کم و بیش 40 سے زائد قلعے مٹی او پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ان میں سے بعض پرانے خشک دریائے ہاکڑہ کے کنارے واقع ہے۔ ہندوستان میں اُسے گھاگھر اور پاکستان میں ہاکڑہ کہتے ہیں۔ جو ویدک دور میں دریا سرسوتی کے طور پر جانا جاتا تھا۔1000 ق۔م میں اس دریا کا پانی گنگا جمنا میں چلے جانے کی وجہ س خشک ہوا گگھڑ ہاکڑہ دریا اپنے طور پر جنوب مغرب کی طرف ہندوستانی ریاستوں بیکانیر اور جیسلمیر کی طرف بہتا رہا اور رن آف کچھ میں جا کر ختم ہو جاتا۔یہیں اس دریا کے اطراف واکناف میں ڈاکٹر محمد رفیق مغل نے 400 پرانی بستیوں کا سراغ آج سے سترہ سال قبل لگایا جو 4000 ق۔م سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک کی کہانی بیان کر رہی ہیں[103]۔

اس قلعہ کی پرانی تاریخ کے بارے میں اگر چہ کتب خاموش ہیں مگر اس کی تاریخ اس وقت سے ملتی ہے جب ریاست بہاولپوری کے پہلے نواب صادق محمد خان اول نے 1733ء میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ 6 سال بعد نادر شاہ نے اسے نواب کا خطاب دیا اور اس کی مملکت کی حدود میں شکارپور، لاڑکانہ، سیوستان اور Chhatas کا علاقہ دراوڑ کے علاوہ شامل تھا۔ دوسرے نواب بہاول خان اول کے زمانہ میں یہ قلعہ 1747ء میں راول رائے سنگھ کے تصرف میں رہا یہ قلعہ 12 سال بعد تیسرے نواب مبارک خان کو اس شرط پر دے دیا گیا کہ وہ قلعہ کی آدھی آمدنی دے گا[104]۔

بہاولپور شہر اور دراوڑ قلعہ 1788ء میں پنجور شاہ کے قبضہ میں آیا اور مختصر مدت کے لئے شاہ محمد خان کے قبضہ میں ہا مگر جلد ہی یہ دونوں جگہیں چوتھے نواب نواب عادل خان دوم کے قبضہ میں چلے گئے یہ قلعہ 18 ویں صدی کے آخری چوتھائی سے لے کر اب تک بہاولپور ریاست کے ماتحت رہا۔شاہی قبرستان اور ایک سنگ مرمر کی مسجد قلعہ

کے باہر واقع ہے کبھی یہ قلعہ ایک معروف تجارتی مرکز تھا[105]۔

قلعہ دراوڑ کے 40 برج اور مینار ہیں۔ قلعہ کے اندر ایک کنواں ہے۔ اور مرکزی داخلی کے قریب ایک بڑا تالاب ہے یہ ایک مستطیل عمارت ہے جو جنوبی طرف کے گیٹ سے 220 میٹر ہیں یہی اس کا داخلہ دروازہ ہے جو ایک بڑے راستے سے پیوستہ ہے اس کے برج بڑی حد تک محفوظ ہیں جن کے اوپر زیادہ پکائی ہوئی اینٹوں سے مختلف جیومیٹریکل پیٹرن بنائے گئے ہیں۔ برجوں کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں مرمت کئے گئے ہیں۔ قلعہ کی دیواریں 20 میٹر تک بلند ہیں۔ قلعہ کے شمال مشرقی کونے میں ایک بڑا تالاب (ٹوبہ) موجود ہے جس سے علاقہ کے مویشی اور لوگ پیاس بجھاتے ہیں۔

قلعہ کی عمارت سطح زمین سے 20 میٹر بلند ہے۔ اور اس میں متعدد عمارات نواب کی فوج کے زیر استعمال رہیں۔ جبکہ شمال مشرقی برج کی پشت پر ایک خوبصورت مزین عمارت نواب کے لئے بنائی گئی ہے۔

دراوڑ ڈیرہ نواب صاحب آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ایک سڑک جنوب کی طرف سے قلعہ کی طرف جاتی ہے اور پکی سڑک سے آگے 15 میل کچی سڑک قلعہ تک پہنچتی ہے اس جگہ پرندے اور ہرن اکثر نظر آ جاتے ہیں۔ اس قلعہ کو دیکھنے کے لئے بہترین وقت نومبر فروری تک ہے مگر نواب صاحب کے خاندان سے اس کی اجازت لینا پڑتی ہے۔

شاہی قلعہ لاہور

یوں تو لاہور کی قدیم تاریخ ماضی کے اوراق میں گم گشتہ ہے تاہم تہذیبی تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے اس شہر کی اپنی انفرادیت ہے۔ ابتدائی تاریخ روایات پر مبنی ہے عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ راجہ رام چندر جی (1200 ق م۔ تا 800 ق م) کے دو بیٹے تھے

ایک کا نام لوہ تھا جس نے لاہور کی بنیاد رکھی دوسرے کا نام قصو تھا جس نے قصور کی بنیاد رکھی۔ لاہور کا ذکر ہمیں ''حدود العالم'' نامی مخطوطہ میں ملتا ہے[106]۔ جو 994ء کی تصنیف ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر غزنوی دور میں ملک ایاز کے ہاتھوں ہوئی جب تک یہ کچی مٹی کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ بعد میں پختہ قلعہ عہد اکبری میں تعمیر ہوا۔ اکبر 1557ء 1571ء اور 1586ء میں لاہور آیا اور باقاعدہ پختہ اینٹوں سے اس کی تعمیر کا حکم کر کے لاہور کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نورالدین محمد جہانگیر 1606ء میں لاہور آیا۔ اور ایک سال تک قلعہ میں قیام کیا۔ لاہور آنے سے قبل اس نے شاہی عمارات کی بحالی کے ماہر عبدالکریم معموری کو لاہور قلعہ کی بحالی اور مرمت کے لیے بھیجا۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

''میرا ارادہ تھا کہ میں دکن کی طرف جاؤں اس لئے عبدالکریم معموری (معماری) کو حکم دیا کہ میری روانگی سے پہلے وہاں جا کر موضع مندومین میں شاہی عمارت بنوائے اور قدیم بادشاہوں کی یادگاروں کی از سر نو مرمت کرائے[107]۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

''مانڈو میں پہنچنے سے پہلے عبدالکریم معموری کو میں نے روانہ کر دیا تا کہ وہ مانڈو کے زمانہ قدیم کے حکام کی تعمیر کردہ عمارت کو از سر نو تعمیر کرائے کیونکہ عبدالکریم نے اجمیر کی بہت سی عمارتوں کو بالکل نئی حالت میں کر دیا تھا۔ اس لئے مانڈو میں بھی اس نے عمارت کی مرمت کرا کے بے نظیر بنا دیا جس پر تین لاکھ روپے صرف ہوئے[108]۔''

26 ماہ اسفند مذکور مانڈو کی قدیم عمارات کی تکمیل کے صلہ میں عبدالکریم کے منصب میں اضافہ کر کے ہشت صدی ذات و چار سو کے منصب پر فائز کیا۔ اور معمور خان کے خطاب سے نوازا جہانگیر 1026ھ کے ضمن میں مزید لکھتا ہے۔

انہیں ایام میں معمور خان لاہور کی شاہی عمارت کی تعمیر و مرمت کے لئے روانہ ہوا۔ پیر 9 ماہ آذر کو باغ مومن سے ہاتھی پر سوار ہو کر روپے نچھاور کرتا ہوا لاہور کی

جانب روانہ ہوا اور سہ پہر دو گھڑی اور دولت خانہ حاضر ہوا جس عمارت میں میں نے قیام کیا تھا وہ معمور خان کے زیر اہتمام تعمیر ہوئی اس کی دیواروں کو مصوری سے منقش کیا ہوا تھا[109]۔

شاہی قلعہ کے پوسٹرن گیٹ سے داخل ہوتے ہی ہاتھی پول دروازے کے اوپر نستعلیق میں ایک خوبصورت کتبہ نصب ہے جو 1041ھ/ 1631ء میں رقم کیا گیاں جس کی عبارت یوں ہے[110]۔

''شاہ جم جاہ سلیماں قدر کیوان بارگاہ۔ در صفا و رفعت ولطف و ہوا برجی چنیں۔ گز سپہر و مہر برتر بردہ روایات جلال۔از حصار چرخ نمو واست و نماید جمال۔ ثانی صاحب قرآن، شاہ جہاں کر عدل بود نیسش نوشیرواں مانند افریدوں ہمال۔ بندہ یکدل مرید معتقد عبدالکریم بعد اتمام عمارت یافت ایں تاریخ سال شاہ برجی حکم کرد احداث کز فرط علو وایما چوں دولت ایں بادشاہ و جم سپاہ۔ ہست بیرون ہچو عرش اعظم از وہم وخیال۔ ابن ہمایوں برج عالی بادر آفت بی زوال (۱۰۴۱ھ)[111]''

اس طرح مکاتیب خانہ کی عمارت پر عمدہ نستعلیق میں ابھرویں انداز میں یہ کتبہ رقم ہے جو تاریخ کتبات میں عمدہ و نادر ہے۔

''سال دوازدہم از جلوس مقدس بندگان عالی حضرت شہنشاہ ظل اللہ سلیمان جاہ، کیومرث بارگاہ سکندر سپاہ خلافت پناہ، نور الدین محمد جہانگیر ابن جلال الدین اکبر بادشاہ غازی بمطابق سال ہزار و بیست وہفت ہجری، عمارت ایں دولت خانہ ہمایوں باحق کمترین مریدان و غلامان فدوی معمور خان صورت اتمام پذیرفت[112]'' فتح پور سیکری میں بھی اس قسم کا کتبہ نصب ہے جسے امانت خان شیرازی محمد حسین کشمیری یا عبدالرشید ویلمی نے لکھا ہے۔

شاہی قلعہ لاہور جو مغلوں کے فن تعمیر کی بے مثال یادگار ہے جسے انہوں نے رہائش کے لئے تعمیر کیا مگر فوجی مقاصد کو نظر انداز ہرگز نہیں کیا گیا۔ پکی اینٹوں سے اس

کی بنیاد 1566ء میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے رکھی اس کی لمبائی 466 میٹر اور چوڑائی 370 میٹر ہے اس کی شکل تقریباً مستطیل ہے دیواریں سرخ پختہ خشتی ہیں۔ جن کی چنائی مٹی گارے چونے سے کی گئی ہے۔ دیواروں پر بندوقچیوں کے سوراخ اور دشمنوں پر گرم پانی انڈیلنے کے راستے بنے ہوتے تھے۔ یہ قلعہ اپنی وسعت وشہرت کے لحاظ سے پاکستان بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہے[113]۔

قلعہ کے اندر مختلف ادوار میں جو عمارت تعمیر ہوئیں جن کو ہم چھ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1- عہد اکبری کی عمارات
2- نورالدین کی تعمیر کردہ عمارات
3- شاہ جہاں کی تعمیر کردہ عمارات
4- اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کردہ عمارات
5- سکھ دور کی عمارات
6- قلعہ دوران انگریزی حکومت۔

1-عالمگیری گیٹ

اگرچہ تاریخی تواتر سے عالمگیری گیٹ کی تفصیل پہلے لکھنا غلط ہوگا۔ مگر آج جب آپ ٹکٹ لے کر قلعہ دیکھنے آتے ہیں تو اسی دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہیں شاہی قلعہ کی مغربی دیوار سے منسلک یہ دروازہ اورنگزیب عالمگیر نے 1673/74ء میں تعمیر کرایا ٹھیک اسی جگہ اکبری دور میں ایک دروازہ تھا۔ اورنگزیب عالمگیر نے اسے ازسرنو تعمیر کرایا جس کے نام پر اسے عالمگیری دروازہ کہا گیا۔ خوبصورتی اور شان وشوکت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے بڑے بڑے مثمن برج کنول کی پتیوں سے آراستہ ہیں جبکہ گنبدنما برجیاں دروازہ کے اندر اوپر نیچے محراب دار دو کمرے موجود ہیں اس دروازہ کے اندر داخل ہونے کے بعد دائیں جانب ایک راستہ ملتا ہے جس کے اوپر

نیچے محافظوں کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ جبکہ بالکل سامنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بانی لاہور''لوہ'' کا مندر ہے اس مندر کی شمال میں بلندی پر ایک مثمن دروازہ ہے جس پر جانے کے لئے بڑی بڑی سیڑھیاں تھیں جو برطانوی عہد میں ختم کردی تھیں۔

۲۔مغل مطبخ واصطبل

شاہی قلعہ کے جنوب مغرب کی طرف مغل شاہی مطبخ اور اصطبل موجود ہے۔ یہ مطبخ بہت بڑہال اور چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا جس کے کئی دروازے تھے جہاں انواع قسم کے کھانے تیار ہوتے جو کہ شاہی دسترخوان کی زینت بنتے ہیں[114]۔ برطانوی عہد میں باورچی خانہ اور اصطبل کی عمارت کوختم کر کے پولیس کی بارکیں بنا کر اس جگہ کو جیل کا درجہ دے دیا گیا۔اب یہاں پاکستان آرکیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ ریسرچ کام کررہا ہے۔

۳۔قلعہ کی جنوبی دیوار

اس دیوار کو برطانوی عہد میں توڑ کر سیڑھیاں اوپر چبوترے بنا دیئے تا کہ قلعہ دوبارہ دفاعی مقاصد کے لئے استعمال نہ ہو سکے۔اس دیوار کے شمال میں دھیان سنگھ کی بارہ دری تھی جو اب منہدم ہو چکی ہے اس بارہ دری اور دیوار کے اوپر مختلف قسم کے فوارے لگے ہوئے ہیں[115]۔

۴۔دیوانِ عام

عہد اکبری کی دولت خانہ خاص وعام کی جنوبی دیوار سے متصل دیوان عام جو آصف خان کی زیرنگرانی شاہ جہاں کے حکم 32-1631ء میں مکمل ہوا مسجدی دروازہ کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ سنگ سرخ کے چالیس ستونوں پر مشتمل خوبصورت عمارت ہے جس کی لمبائی 62 میٹراوراونچائی 11 میٹر ہے۔ یہ عمارت 1.5 میٹر اونچے چبوترے پر بنائی گئی ہے۔ جس کے تین اطراف سنگ سرخ کا خوبصورت کٹہرا بنا ہوا ہے۔ اور ہر

طرف سے راستہ چبوترے پر جاتا ہے۔ جس سے امراء وزراء اور عمائدین دیوان سے داخل ہوتے تھے۔ 1841ء میں سکھوں کے باہمی خلفشار کی وجہ سے اس عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ شیر سنگھ نے قلعہ پر بادشاہی مسجد کے میناروں سے گولہ باری کی جس سے اس کا کافی حصہ گر گیا جسے انگریزی عہد میں مرمت کیا گیا۔ 1927ء میں قلعہ کے ساتھ یہ عمارت محکمہ آثار قدیمہ کے پاس چلی گئی۔

۵۔ دولت خانہ خاص و عام اکبری محل

دیوان عام سے ایک زینہ جھروکہ درشن کو جاتا ہے۔ اس جھروکہ کے پیچھے اکبری عہد کا دولت خانہ خاص و عام ہے۔ جس کی تعمیر اکبر کے حکم پر 1587ء میں شروع ہوئی اور 18-1617ء میں بعہد جہانگیری مکمل ہوئی جس پر سات لاکھ روپے خرچ ہوا[116]۔ یہ محل 116 کمروں پر مشتمل تھا اب جس کا کافی حصہ ختم ہو چکا ہے۔ صرف بنیادوں کے آثار باقی ہیں۔ اس وقت جو حصہ بچا ہوا ہے اس میں دولت خانہ خاص، جھروکہ اور کچھ رہائشی کمرے ہیں۔ دولت خانہ چار کمروں پر مشتمل ہے دیواروں اور چھتوں کو چونے کی رنگین گلکاری اور منبت کاری سے سجایا گیا ہے۔ دولت خانہ کے جنوبی جانب جھروکہ ہے جو سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ہے اس میں بیٹھ کر بادشاہ لوگوں کو درشن دیا کرتا تھا اس محل کا مشرقی حصہ ابھی تک محفوظ ہے۔

۶۔ کھڑک سنگھ کا محل

دولت خانہ خاص و عام کی مشرقی جانب اور احاطہ جہانگیری کے جنوب مشرقی جانب ایک دو منزلہ عمارت ہے اس عمارت کا زیریں حصہ عہد اکبری کا ہے جبکہ اوپر والی عمارت راجہ رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کے لئے بنوائی۔

یہ محل آٹھ بڑے کمروں اور بڑے ہال پر مشتمل تھا جس کی چھت لکڑی اور دیواروں پر چونے کا پلستر کیا گیا اس عمارت میں آج کل محکمہ آثار قدیمہ کے دفاتر

ہیں۔اس حویلی کی نچلی منزل جہاں آج کل لائبریری ہے دراصل عہد اکبری کے دولت خانہ خاص و عام کا ایک حصہ ہے۔

۷۔مسجدی یا مستی دروازہ

جہانگیر کی والدہ مریم زمانی نے 1614ء کو قلعہ کے مشرقی دروازہ کے باہر عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اس مسجد کی قربت کی وجہ سے اس کا نام مسجدی دروازہ رکھا گیا جو بعد میں بگڑ کی مستی روازہ بن گیا۔ یہ دروازہ 1566ء میں تعمیر ہوا جس کے دونوں اطراف مثمن برج ہیں اور مدافعت کے لئے دندانے دار فصیل ہے۔

۸۔احاطہ جہانگیری

دیوان عام کی شمال جانب ایک وسیع سبزہ زار ہیں مغلیہ طرز کا یہ باغ برطانوی عہد حکومت میں ختم کر کے ٹینس کھیلنے کے لئے جگہ بنادی گئی اس باغ کی لمبائی 123 میٹر اور چوڑائی 82 میٹر ہے۔اسے چہار باغ کے نمونے پر تعمیر کیا گیا ہے اس کے وسط میں مربع شکل کا ایک حوض ہے۔جس میں 32 فوارے لگے ہیں۔حوض کے درمیان میں مہتابی ہے جس تک پہنچنے کے لئے شرقاً،غرباً، راہداری ہے۔

۹۔خوابگاہ جہانگیری و عجائب گھر

اکبری محل کے شمال جانب ایک بہت بڑی عمارت ہے جسے خواب گاہ جہانگیری کہتے ہیں۔ یہ عمارت 46 میٹر لمبی اور 18 میٹر چوڑی دو چھوٹے کمروں اور ایک بڑے درمیانی ہال پر مشتمل ہے جس کے جنوب کی طرف برآمدہ ہے۔ یہ عمارت جس کا اندرونی حصہ پچی کاری کا خوبصورت نمونہ ہے اور غالب کاری منبت کاری اور ہندی نقش و نگاری سے آراستہ ہے۔ اس عمارت کا ایک دروازہ ہے جو درمیانی ہال سے برآمدہ میں کھلتا ہے۔آج کل اس عمارت کو ایک چھوٹے سے عجائب گھر میں تبدیل کر کے مغل بادشاہوں

کے سکے، کتبے، مخطوطات، تصاویر، خطوط، مجلکے، وغیرہ زیر نمائش ہیں۔ مرکزی ہال میں ہاتھی دانت کا تاج محل آگرہ کا خوب صورت ماڈل رکھا ہوا ہے۔

۱۰۔ سہ دریاں

خواب گاہ جہانگیری کے مشرقی اور مغربی جانب دو دریاں تھیں۔ جن میں اس وقت مشرقی سہ دری باقی ہے دراصل یہ ایک کماندار چھت والا برج چھوٹا سا کمرہ ہے جو جہانگیری دور کی تعمیر ہے۔ اس کی مشرقی جانب مغلیہ عمارات کو انگریزی دور میں چرچ کی حیثیت حاصل تھی جو بعد میں ختم ہوگئی۔ اس عمارت سے ایک زینہ نیچے کی طرف جاتا ہے جہاں آج کل لیبارٹری ہے اس سہ دری کے سامنے ایک چھوٹا سا حوض ہے، جس میں فوارا لگا ہوا ہے اس عمارت کے تین دروازے اور دو چھتری نما گنبد ہیں درمیان میں کماندار چھت اور چاروں طرف چھجہ ہیں یہ فن مصوری کے مختلف نمونوں سے مزید تھی جس کے نقوش اب تقریباً مٹ چکے ہیں۔

۱۱۔ زنانہ شاہی حمام

احاطہ جہانگیری کے جنوب مغربی کونہ میں قطار اندر قطار کمرے ہیں جن کے آخر میں بجانب شمال ایک خوبصورت کمرہ ہے اور شاہی زنانہ حمام جو اکبری عہد سے متعلق ہے اس حمام میں خوبصورت مصوری کی گئی ہے جس پر اکثر خواتین اور پریوں کی تصاویر اس کمرہ کے عید سامنے ایک خوبصورت فوارے پر مشتمل حوض ہے۔

۱۲۔ محل رانی جنداں و عجائب گھر

احاطہ جہانگیری کے جنوب مغربی طرف ایک بلند عمارت رانی جنداں کے نام سے موسوم ہے جو راجہ رنجیت سنگھ کی سب سے چھوٹی اور نرم دل بیوی تھی راجہ نے جہانگیر کی تعمیر کردہ عمارت کے اوپر ایک اور منزل تعمیر کرائی جنداں کی زندگی میں یہ عمارت اس

کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس عمارت کے نچلے حصے میں تیر وتفنگ، سامان حرب کی نمائش جاری ہے مختلف کمروں پر مشتمل اس کا مشرقی حصہ عہد اکبری کی یاد تازہ کرتا ہے اس وقت پوری عمارت میں میوزیم قائم ہے۔ جس میں سکھوں سے متعلقہ نوادرات زیر نمائش ہے۔

۱۳۔ مکاتیب خانہ

ایک نہایت ہی سادہ مربع نما جگہ پر چاروں اطراف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ دولت خانہ یا مکاتیب خانہ کے نام سے موسوم ہے اس کی تعمیر 18-1617ء میں عہد جہانگیری میں ہوئی یہ عمارت ڈیوڑھی کے طور پر استعمال ہوتی تھی اس عمارت کے کمرے محراب نما بنے ہوتے ہیں جبکہ دو دروازے ہیں ایک جانب مشرقی جبکہ دوسرا شمال جانب واقع ہے مشرقی دروازہ پر ایک کتبہ تحریر ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے یہ عمارت عبدالکریم معمور خان نے تعمیر کرائی۔ یہاں منشی اور خطاط حضرات بیٹھا کرتے تھے جو شاہی محل میں آنے جانے والوں کے حلیے اور فرامین لکھا کرتے۔

۱۴۔ موتی مسجد

برصغیر کی چار موتی مسجدوں میں سے ایک ہے جو سب سے قدیم ہے۔ سنگ مرمر کی بنی ہوئی یہ مسجد 1618ء میں مکمل ہوئی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ عہد شاہ جہانی میں 1645ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کے صحن کی لمبائی تقریباً 18.5 میٹر اور چوڑائی 10.5 میٹر ہے۔ اور 2.3 میٹر اونچے پلیٹ فارم پر بنائی گئی ہے اس مسجد کے چاروں اطراف حجرے ہیں سکھ دور میں اس مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا اور اسے شاہی خزانہ کے رکھنے کی جگہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا آخری وائسرائے لارڈ کرزن کے احکامات پر اس مسجد کا تقدس از سر نو بحال کر دیا گیا۔

۱۵۔احاطہ شاہ جہانی

قلعہ لاہور میں عہد شاہ جہانی کی عمارات کو احاطہ شاہ جہانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جو احاطہ جہانگیری کے پہلو میں ہے۔

۱۶۔خواب گاہ شاہ جہانی

یہ عمارت احاطہ جہانگیری کے جنوب مغربی اور دیوان خاص کے بالمقابل وسیع کمروں پر مشتمل ہے یہ عمارت 1633ء میں تعمیر ہوئی وسطی کمرے میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں خوبصورت فوارہ نصب کیا گیا ہے اس کمرے کے سامنے ایک اور کمرہ تھا جو اب ختم ہو چکا ہے۔ صرف فوارے کے آثار باقی ہیں۔ باقی پوری عمارت مصوری' آئینہ کاری' پلاسٹر کے نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ تھی جو اب ختم ہو چکی ہیں۔ یہ عمات سکھوں کی بد ذوقی اور انگریزوں کی حریص فطرت ی وجہ سے تباہ ہوئی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے مرمت کے وقت اصل مصوری طلا کاری اور رنگین آرائش دریافت ہوئی۔

۱۷۔دیوان خاص

منبت کاری سے مزید سفید سنگ مرمر کی یہ خوبصورت عمارت خوابگاہ شاہ جہانی کے بالمقابل قلعہ کی شمالی دیوار کے اوپر بنائی گئی ہے اس کا رقبہ 16.5x16.5 میٹر اور اونچائی 6 میٹر ہے۔ یہ عمارت 1645ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کے عین وسط میں پیالہ نما فوارہ ہے جو ایک ہی پتھر کی سل کو تراش کر بنایا گیا ہے اس عمارت کو سکھوں اور انگریزوں کے دور میں نقصان پہنچنے کے باوجود قلعہ لاہور کی خوبصورت ترین عمارت شمار ہوتی ہے۔ دیوان خاص اور خوابگاہ شاہ جہانی کے درمیان ایک باغیچہ ہے جس کے درمیانی حصہ میں سنگ مرمر کا فوارا نصب ہے جو کبھی قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں سے مزین

تھا۔ یہ باغیچہ بھی چہار باغ کی طرز پر آراستہ ہے[117]۔

۱۸۔عرض گاہ

دیوان خاص سے اگر نیچے دیکھا جائے تو دیوار کے ساتھ چھوٹی عمارت نظر آتی ہے جسے عرض گاہ کہا جاتا ہے یہاں امرائے شاہ جہاں صبح سویرے بادشاہ کے احکام سنتے تھے۔ اگر چہ تعمیری لحاظ سے یہ عمارت سکھ دور کی معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۔لال برج

دیوان خاص کے خواب میں ایک ہشت پہلو بلند عمارت ہے جسے لال برج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ برج ابتداء میں دو منزلہ عمارت تھی جسے 1617ء میں جہانگیری عہد میں تعمیر کیا گیا۔ اس کی شمالی دیوار اندرونی اور بیرونی اطراف سے خوب صورت گل کاری اور نقش و نگار سے آراستہ ہے جبکہ دیواریں محراب دار ہیں۔ عمارت کے اندر جانے کے لئے دو راستے ہیں۔ اوپر جانے کے لئے شمال مغربی کونہ کے زینے ہیں اس عمارت کے وسط میں ایک بڑا سا حوض تھا جس میں فوارے لگے ہوتے تھے سکھ دور میں اس کی تیسری منزل بنا دی گئی جو اب گر چکی ہے یہاں سے ایک زینہ عرض گاہ کو جاتا ہے[122]۔

۲۰۔کالا برج

بائیں باغ کے شمال مغربی کونے پر ایک عظیم عمارت ہے جسے سکھوں نے کالا برج کا نام دیا۔ عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اکبری عہد کی عمارت ہے اس میں خوبصورت تصاویر اپنی مثال آپ ہیں۔ جو عیسائی اثرات کی حامل ہیں[119]۔

۲۱۔خلوت خانہ

لال برج اور کالا برج کے درمیان اور پائیں باغ کے شمالی جانب ایک چھوٹی سی

عمارت ہے جس کو خلوت خانہ کہتے ہیں۔ 1633ء میں تعمیر ہونے والی عمارت کے سامنے ایک چھوٹا مربع نما حوض ہے جو فوارے سے مزین ہے نام کی مناسبت سے مغل شہزادیاں بناؤ سنگھار کرتی تھیں۔

۲۲۔ پائیں باغ

خلوت خانہ اور شاہی حمام کے درمیان چہار باغ کی طرز پر شاہی مستورات کے لئے پائیں باغ بنایا گیا جس کے چاروں اطراف برآمدے تھے اور جابجا فوارے تھے۔

۲۳۔ شاہی حمام

پائیں باغ کے جنوب اور جنوب مشرقی حصہ میں ایک عمارت ترکی کی طرز تعمیر کا نمونہ ہے جو شاہ جہاں کے حکم پر 1633ء میں تعمیر ہوئی اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا جہاں دو مربع او ایک مستطیل کمرے میں ان کمروں کو نیم گرم اور ڈریسنگ روم میں تبدیل کیا گیا ہے اس حمام کے مشرقی جانب ایک ہشت پہلو حوض سنگ مرمر کا ہے جس کے بیچوں بیچ ایک فوارا ہے۔ جس میں مٹی چونے کے پائپ کے ذریعے پانی آتا تھا۔

۲۴۔ شاہی مسجد برائے مستورات

کالا برج کے جنوب اور پائیں باغ کے مغرب میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی بنی ہوئی نہایت ہی خوبصورت مسجد ہے جو خواتین کے لئے مخصوص تھی راجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر اس مسجد کو گرادیا گیا اب صرف اس کا رنگ دار مرمریں فرش اور دیواریں باقی ہیں۔

۲۵۔ سادھ یا گوردوارہ

زنانہ مسجد کے جنوبی سمت سکھ دور کا گوردوارہ ہے جو بلند مربع چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے جس کی دیواریں بند محرابوں سے سجائی گئی ہیں۔

۲۶۔آٹھ درہ

رنجیت سنگھ کا تعمیر کردہ آٹھ درہ شیش محل کے بیرونی احاطے میں مشرقی دیوار سے متصل ہے جس کے آٹھ در ہیں جن میں 5 مشرقی اور 3 جنوبی اطراف ہیں جن کی لمبائی 13 میٹر اور چوڑائی 8 میٹر ہے اس کی چھت مختلف رنگوں سے گلکاری کے شیشوں سے مزید کی گئی ہیں۔ یہاں رنجیت سنگھ کھلی کچہری لگاتا تھا۔ اس جگہ کو مختلف عمارتوں سے پتھر اکھاڑ کر تعمیر کیا گیا ہے۔ کالا برج اور آٹھ درہ کے درمیان دربار ہوا کرتا تھا۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک کنواں ہے جہاں زنانہ مسجد اور شیش محل کو پانی مہیا ہوتا تھا۔

۲۷۔احاطہ شاہ برج

قلعہ کے شمال مغربی کونہ میں سب سے نمایاں حصہ احاطہ شاہ برج ہے جو شاہ جہانی تعمیرات کا نادر نمونہ ہے جس کا آغاز 1624ء میں ہوا۔ اس کی تکمیل 1631ء میں عہد شاہ جہانی میں ہوئی۔ اس کا اصل نام شاہ برج ہے اور ثمن برج کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

۲۸۔شیش محل

قلعہ کے شمال مغربی کونہ میں واقع یہ عمارت مغلیہ شان وشوکت کی عکاس ہے جو 32-1631ء میں شاہ جہاں کے حکم سے آصف خان نے تعمیر کرائی یہ محل شاہ جہاں نے اپنی محبوب ملکہ ممتاز محل کے لئے تعمیر کرایا تھا مگر اسے کبھی یہاں ایک رات گزارنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ 1631ء میں ممتاز محل اورنگ آباد میں وفات پا گئی۔

یہ ہشت پہلو عمارت علاقہ کی حسین ترین عمارت ہے جسے مختلف فنون سے آراستہ کیا گیا جس کے سامنے والے حصے کی پانچ محرابیں ہیں اور 12 پہلو دار سنگ مرمر کے منقش ستون ہیں جنہیں منبت کاری سے آراستہ کیا گیا ہے پیچھے ایک بہت بڑا مستطیل برآمدہ ہے جو مکمل طور پر آئینہ کاری سے مزین ہے اس برآمدہ کے پیچھے ایک

مثمن کمرہ ہے جس کے دائیں بائیں ہشت پہلو کمرے ہیں۔ اس کی شمالی دیوار میں خوبصورت جالی نصب ہے پوری عمارت آئینہ کاری، منبت کاری، پچی کاری، گلکاری اور جیومیٹریکل ڈیزائن کا حسین امتزاج ہے جبکہ صحن کا فرش سنگ بادل، سنگ کھٹو، سنگ موسیٰ کی سلوں سے بنایا گیا اس کے بیچوں بیچ ایک پیالہ نما آبی تالاب ہے جنہیں چار چھوٹی نہروں سے ملایا گیا ہے اور خاص مقامات پر فوارے نصب ہیں۔ تالاب کے وسط میں ایک مہتابی ہے۔

۲۹۔ نولکھا

شاہ برج کی مغربی دیوار سے متصل سفید سنگ مرمر کی ایک خوبصورت عمارت ہے۔ جسے نولکھا کہا جاتا ہے۔ یہ مخروطی چھت کا مستطیل کمرہ ہے اس کے تین دروازے صحن کی طرف کھلتے ہیں۔ جبکہ دو چھوٹے چھوٹے دروازے طرفین میں ہیں۔ اس عمارت میں منبت کاری، جالی کا کام انتہائی نفیس ہیں رنجیت سنگھ نے اس جگہ کو بطور رہائش استعمال کیا اور اپنی ضرورت کے مطابق اس عمارت کی نفاست کو خوب متاثر کیا۔ سکھوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے باوجود عمارت آج بھی دیدنی ہے۔

۳۰۔ ہاتھی پیر سیڑھیاں

شیش محل کی جنوبی دیوار سے متصل شاہ برج دروازہ کے ساتھ شیش محل کے پاس جانے والی سیڑھیاں ہیں جہاں خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر شیش محل آتی جاتی تھیں۔ راستہ کے دونوں اطراف محراب نما غلام گردشیں ہیں۔

۳۱۔ شاہ برج دروازہ

عبدالکریم معمور خاں نے یہ دروازہ 1631ء میں تعمیر کرایا جو کاشی کاری سے مزین ہے۔

۳۲۔قلعہ کی مصور دیوار

شاہی قلعہ لاہور کی بیرونی جنوبی دیوار اور شمالی دیوار فن کاشی کی لازوال تاریخ رقم کر رہی ہے۔ اس دیوار کا کل رقبہ تقریباً ۸ ہزار مربع میٹر ہے اس کا شمالی حصہ جہانگیری دور میں شروع ہوا اور مغربی حصہ شاہ جہاں کے عہد میں 32-1631ء میں مکمل ہوا مگر دیواروں پر چمکدار چینی کاری رنگوں کے ساتھ ساتھ ٹائیلوں پر مصوری آب وتاب آج بھی موجود ہے۔

دیوار پر بنائے گئے چوکھٹوں میں انسانوں، جانوروں، پرندوں کی اشکال ہاتھیوں کی لڑائی، شتر سواری، شہ سواری، شمشیر زنی، شیر کا شکار، چوگان کا کھیل، فرشتوں کا خیالی تصاویر، گلکاری کے نمونے اپنی مثال آپ ہیں اکثر چوکھٹوں میں شہزادوں کے روزمرہ کے مشاغل کو نمایاں کیا گیا یہ دیوار اپنی نوعیت اپنی انفرادیت کے لحاظ سے دنیا بھر میں واحد ہے۔ دنیا بھر میں ایسی مزین دیوار کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

۳۳۔تہہ خانے

قلعہ کے اندر جا بجا نظر آنے والی سرنگیں دراصل تہہ خانے تک رسائی کے لئے راستے ہیں۔قلعہ کے نیچے انگریزی حرف F کی شکل کے تہہ خانے موجود ہیں۔جن میں کچھ راستے دریا کے کنارے تک کھلتے ہیں اور یہ تہہ خانے سرمائی محل کی ضرورت پوری کرتے تھے۔سخت گرمی میں مغل مستورات نیچے تہہ خانے میں چلی جاتیں، تہہ خانے راوی دریا کے کناروں سے متصل ہونے کیوجہ سے ٹھنڈے ہو جاتے جو دریا کے پانیوں کو چھو کر ٹھنڈی ہوا اس جگہ کو مزید ٹھنڈا کر دیتی۔

۳۴۔رنجیت سنگھ کی تعمیر کردہ فصیل

قلعہ کی شمالی دیوار کے تقریباً 20 میٹر پیچھے ایک فصیل ہے جسے رنجیت سنگھ نے فوجی مقاصد کے لئے بنوایا مگر اس دیوار نے دنیا کی عجوبہ مصور دیوار کی بڑی حد تک

محفوظ کر دیا۔

۳۵۔روشنائی دروازہ

حضوری باغ کے شمالی جانب اور راجہ رنجیت سنگھ کے سمادھ کے ساتھ ایک بڑا محراب دروازہ ہے جسے روشنائی دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ دو منزلہ اکبری عہد کا ہے اور لاہور کے ان بارہ دروازہ میں ایک ہے جو عہد مغلیہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

قلعہ روات

جی ٹی روڈ پر راولپنڈی سے جہلم کی طرف 11 میل کے فاصلہ پر قلعہ روات شمالی طرف 30°-33° اور 12°-73° مشرق کی طرف واقع ہے۔ روات دراصل عربی لفظ رباط کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب سرائے ہے۔ یہ قلعہ ایک مربع شکل میں "9-'306 شرقاً غرباً طرف سے اور "9-'384 شمالاً جنوباً سے اس کے برج قدرے گول اور چاروں کونوں پر ہیں اور اس مشرق اور شمال اطراف داخلی دروازے ہیں، جبکہ جنوب میں داخلی دروازہ ہے۔ قلعہ کے وسط میں مغربی جانب تین گنبدوں والی ایک بڑی مسجد ہے جبکہ داخلی دروازہ مشرق کی جانب ہے ان دروازوں کے ساتھ اور مسجد کے ساتھ بیرونی دیوار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ جو "9-'7x"3-'6 کے ہیں، پہلے پہل یہاں ایسے 76 کمرے تھے۔ شمال مغربی کونے میں ایک خوبصورت مقبرہ ہے۔ اس قلعہ کا کل رقبہ 24 کنال 11 مرلے ہے[120]۔ جو F.18-45/54 Extt dt.1-4-1955 کے نوٹیفکیشن کے تحت محفوظ عمارت ہے پتھروں کی یہ قلعہ نما عمارت عہد سلاطین 15 ویں صدی عیسوی میں بنائی گئی جسے سلطان محمود غزنوی 1039ء کے نام کے علاوہ گکھڑ سردار سارنگ خان کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے جو اپنے 16 بیٹوں کے ہمراہ شیر شاہ سوری سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا اور اسی جگہ دفن ہوا۔

اس عمارت کی بیرونی دیواریں مضبوطی سے بنائی گئی ہیں۔تمام تعمیر پتھر ریت چونا اور پکی اینٹوں سے کی گئی ہے۔جبکہ مسجد کی سطح کے علاوہ مقبرہ اور داخلی دروازہ چونے کے پلاسٹر سے خصوصی طور پر چمکدار بنائے گئے تھے جن کے اب صرف آثار باقی ہیں۔ محرابوں میں اینٹیں استعمال کی گئی ہیں جبکہ گنبدوں اور محرابوں کے اندرونی اطراف شاندار ہندسی اشکال پر بنائے گئے ہیں۔اس قلعہ کے اندر وسیع علاقے پر مختلف عمارتیں اور مقبرے مسجد بکھرے پڑے ہیں۔آج مقبرے میں کوئی کتبہ نہیں لگا ہوا اس لیے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کون دفن ہے۔اور نہ ہی اس کی صحیح تاریخ معلوم ہے۔ مسجد مغربی طرف کے وسط میں واقع ہے جو مربع شکل میں ہے جس کی پیمائش "9-'39x"9-'96 ہے۔مسجد میں نماز پڑھنے کی جگہ کے اوپر کبھی تین خوبصورت گنبد تھے جو اب شہید ہو چکے ہیں۔مسجد کے چاروں اطراف نماز پڑھنے کے لئے مربع شکل میں جگہ بنائی گئی ہیں جس کی طرزِ تعمیر کے خدوخال مقامی ہیں جبکہ اندر کا ماتھا محرابی طاقچوں سے سجایا گیا ہے۔

مقبرہ کا نقشہ ہشت پہلو ہے جو ہر طرف سے ساڑھے بائیس فٹ ہے۔اور اندر سے اس کا ماتھا اور بیرونی گردن پر ابھرے گنبد کو ڈیزائن کیا گیا ہے جس پر چونے کا لیپ اور پینل بنائے گئے ہیں۔گنبد چھوٹی محرابوں پر اسی طرح بنایا گیا ہے جس طرح مسجد میں بنایا گیا ہے محرابیں گنبد کارنس اینٹوں سے بنائے گئے ہیں جبکہ باقی ماندہ تعمیر پتھروں سے کی گئی ہے۔اس کا طرزِ تعمیر بیرونی طور پر قلعہ روہتاس جیسا ہے۔

ایک چار دیواری کے اندر بہت ساری قبریں ہیں جن میں نمایاں قبر سلطان سارنگ خان کی ہے جو اس قلعہ میں 1546ء میں شیر شاہ سوری کے جرنیل خواص خان کے زیر کمان فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

قلعہ اٹک

(1586ء)

قلعہ اٹک دریائے سندھ کے کنارے راولپنڈی سے ۵۸ میل اور ۴۷ میل پشاور سے جرنیلی سڑک پر واقع ہے۔ جہاں ریل کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ قلعہ سطح سمندر سے ۱۱۱۱فٹ بلند ہے[121]۔ جو ایک خطرناک علاقے اور دو چٹانوں کمیلہ اور جلیلہ کے درمیان واقع ہے ان چٹانوں کا نام کمال الدین اور جلال الدین کے نام پر رکھا گیا جو روشنیہ فرقہ کے بانی کے دو بیٹے تھے، جنہیں دریا میں سزا کے طور پر پھینکا گیا کیونکہ وہ اپنے باپ کے نظریات کا پرچار اکبر کے دور میں کرتے تھے۔

اگست ۱۵۸۱ء میں ایک روز دو بجے دوپہر مغل شہنشاہ اکبر نے ایک تقریب میں اٹک کے قلعہ کی بنیاد رکھی جب اس نے محمد حکیم مرزا گورنر کابل پر فتح پائی اس واقعہ کی یادگار کے طور پر سنگ مرمر کی تختی پر فارسی شعر کندہ کرایا گیا۔ جب سورج کی پہلی شعاع موری گیٹ پر پڑتی ہے۔ تو یہ عبارت صاف پڑھی جاتی ہے[122]۔

سپر شاہان عالم شاہ اکبر
تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

ابجد کے حساب سے اس قلعہ کی تاریخ بنا ۹۹۱ھ/۱۵۸۱ء نکلتی ہے۔ اس عمارت کی تعمیر کے متعدد مقاصد تھے۔ ایک تو بیرونی شمالی حملہ آوروں کی دریا کے پاٹ سے عبور کرنے کی جگہ کی حفاظت، مستعدی اور دوسری وجہ مرزا محمد حکیم دودھ بھائی شہنشاہ اکبر جو اس وقت کابل کا گورنر تھا۔ بہار اور بنگال کی فتح کے بعد جو پہلے اکبر کے قبضہ میں تھیں مرزا محمد حکیم کے وزیروں نے اکبر کی غیر موجودگی میں اکبری علاقوں پر قبضہ کا مشورہ دیا، مرزا حکیم بنیادی طور پر کمزور آدمی تھا اور نہ ہی اتنے بڑے زرخیز علاقے پر حکمرانی کی صلاحیت اس میں تھی[123]۔

فوج کو لاہور میں پابند کرنے کے بعد اکبر بنگال سے دہلی کی طرف روانہ ہوا بغاوت کی خبر سن کر اس نے فوری حکم دیا کہ حملہ آوروں کو تباہ کر دیا جائے۔ لہٰذا کمانڈروں نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر مکمل فتح حاصل کر لی۔ اکبر کے اس فوری عمل نے مرزا محمد حکیم کا دہلی فتح کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

اکبر تیزی سے آیا اور فوری عمل کے ذریعہ حکمران ہند ہونے کا ثبوت دیا اور مرزا حکیم کا ستارہ اقبال غروب ہو گیا۔ مرزا حکیم نے کابل واپسی کا ارادہ کیا شہزادہ مراد نے بھاگتی ہوئی فوج کا خاصا نقصان کیا اور کابل میں داخل ہو گیا اس کے تین دن بعد اکبر بھی وہاں پہنچ گیا اور اپنے کمانڈروں کو ہدایات دینے لگا۔ یہ سب کچھ اگست ۱۵۸۱ء میں ہوا تب اکبر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہاں دریائے سندھ کے کنارے شمالی حملہ آوروں کی روک تھام کے لئے ایک قلعہ ہونا چاہیے[124]۔ یہ کام اکبر نے خواجہ شمس الدین خان کے سپرد کیا جو بعد میں پنجاب کا دیوان مقرر ہوا جس نے اکبر کی ہدایات کی پیروی میں دو سال دو ماہ کی مدت میں قلعہ مکمل کرایا اس کی تاریخ کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں۔

ربیع الثانی ۹۹۱ھ میں بادشاہ نے سندھ کے کنارے قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ ایک چھوٹا قلعہ جسے وہ اٹک بینزس۔'' کا نام دیا۔

ایک اور کہانی جو اس قلعہ کی تعمیر کی بابت ملتی ہے۔ اکبر نے جب دیکھا کہ دریائے سندھ پار نہیں ہوتا تو اس نے اس جگہ کو اٹک کا نام دیا اٹک یعنی روک جب وہ اسے پار کر گیا تو اس نے خیر آباد کا نام دیا[125]۔ اس موقع پر اکبر نے یہاں ایک بڑا بیڑہ تیار کرایا اور جمنا سے بہت سے ملاح یہاں تعینات کیے۔ اوران کے لئے قریبی دیہات کی جاگیر وقف کی آج بھی ان کے وارثان اس جگہ سے مالی منفعت اٹھا رہے ہیں۔ جو دریا کے کنارے رہائش پذیر ہیں اس آبادی کا نام ملاحی ٹولہ ہے۔ قلعہ کی تعمیر کے بعد اکبر نے پہلی بار اس قلعہ کو ۱۵۸۵ء میں دیکھا اور سال کا کچھ حصہ اس جگہ پر گذارا اور

دوبارہ ۱۵۸۸ء میں اس قلعہ میں جہاں تانبے کی سکوں کی ٹکسال وہاں قائم کی۔

فن تعمیر کے لحاظ سے اٹک قلعہ واضح کرتا ہے کہ یہ فتح پور سیکری دہلی اور لاہور کی طرز پر خالصتاً فوجی مقاصد کے لئے تعمیر کیا گیا اس کی چار دیواری ایک میل چاروں اطراف سے ہے جو اٹھارہ گولائی دار برجوں کے ساتھ ملحق ہے۔ ماسوائے ایک کے جو زاویہ قائمہ پر ہے ایک گیلری ان برجوں کو آپس میں ملاتی ہے جس کے نیچے متعدد گارورومز ہیں۔

قلعہ کے برج مقامی چٹانی پتھر سے بنائے گئے ہیں۔ جن پر چونے کی دبیز تہہ چڑھائی گئی ہے۔ داخلی دروازہ پر سرخ پتھر استعمال ہوا ہے جب کہ قلعہ کا دیگر حصہ لاجوردی ٹائیلوں سے بنا ہے۔ اس کا ڈیزائن ویلر نے اپنی کتاب Five thousand year of Pakistan میں دیا ہے۔

قلعہ کی تعمیر کا دلچسپ پہلو وہ گیلری ہے جو برجوں کو باہم ملاتی ہے۔ جو حملہ آوروں سے آگے پیچھے سے بچانے کا ایک ٹھوس ذریعہ ہے۔ گیلری کے زیادہ حصے کی چھت اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہے مگر ایک جگہ سنگ مرمر کی موٹی سلیب لگائی گئی ہے۔ اور قلعہ کو تمام جنگی ہتھیاروں کے استعمال کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے[130]۔

شمالی درمیانی راستے کے مینار کے اوپر کی دیوار سے دریا کا نظارہ بخوبی ہوتا ہے۔ اور مینار کے سامنے اس درمیانی راستے سے چار دروازوں والے حصے پر ایک چھجہ آراستہ ہے۔ پورے قلعہ میں یہی عمارت ہے۔ جو محض رہائش کے لئے بنائی گئی ہے اور آج تک اسی مقصد کے لئے استعمال ہو رہی ہے۔ قلعہ کے اندر داخلہ موری گیٹ کے راستے سے ہے جو سکھی دور ۱۸۳۰ء میں بنایا گیا۔ اس کے علاوہ چار اور داخلی دروازے ہیں جنہیں لاہوری گیٹ، دہلی گیٹ، واٹر گیٹ کے نام دیئے گئے ہیں لاہوری گیٹ پرانا دروازہ ہے۔ زیادہ تر سپاہی یہی دروازہ استعمال کرتے جو بازار کو جاتا ہے۔

جبکہ پرانی جی ٹی روڈ لاہوری گیٹ کے اندر سے گزر کر شہر کے بازار سے گزرتی

ہوئی کابلی گیٹ سے ملاحی ٹولہ گیٹ کی طرف دریا کے کنارے نکل جاتی قلعہ کے اوپر اور نیچے کی جانب راستہ دہلی گیٹ سے جاتا ہے اس طرف ایک بہت بڑا ہال ہے قلعہ کے اوپری حصہ میں عورتوں کے لئے ترکی طرز کا بیگم حمام دلچسپی کی عمارت ہے۔ ترکی سٹائل ایسے حمام کی تعمیر مغلوں کا ایک خاصہ ہے۔ اس حمام سے پہلے ایک داخلی ہال ہے اور چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ اور خوبصورت مزین ستون دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ داخلی ہال میں عورتوں کے لئے سردی اور گرمی کے لئے مخصوص کمرے میں جہاں نہانے والے اپنی مرضی کے گرم سرد پانی سے لطف اندوز ہوتے[127]۔ دوہری دیوار آج بھی دکھائی دیتی ہے جہاں پانی گرم کر کے بھاپ مہیا کی جاتی تھی یہاں سے گزرتے ہوئے سیاح مغلوں کے روائتی انداز تعمیر کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک خفیہ سرنگ اس حصہ سے لاہوری گیٹ کو جاتی ہے جو زیر زمین ہال تک چلی جاتی ہے۔ جہاں بیگمات شاہی آرام کرتیں۔

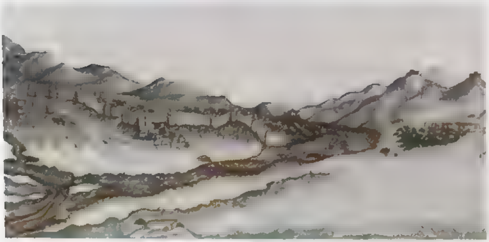
قلعہ کے نچلے حصے میں سڑک پر روشنی کا نظام مہیا کیا گیا ہے آہنی راڈوں سے مزین دہلی اور کابلی دروازے جو مست ہاتھیوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے بنائے گئے انتہائی دلچسپ ہیں۔ واٹر گیٹ کچھ عرصہ سے بند ہے قلعہ کے نیچے دریا کے اندر پتھر کے ستون جو آج کل پرانے پل اور کشتیوں کی زد میں ہیں۔ اس قلعہ کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ پہلی تین صدیوں تک یہ شمالی حملہ آوروں کے راستے کی رکاوٹ رہا۔ ۱۸۴۸ء میں سکھوں سے قلعہ جان نکلسن نے حاصل کیا اور لیفٹیننٹ ہربرٹ نے مسلم افواج کے ذریعے اس پر قبضہ کیا۔ قلعہ کی شمالی طرف اور دریا کے بائیں کنارے بیگم کی سرائے عمارت موجود ہے جب یہ قلعہ تعمیر ہو رہا تھا تو میٹریل رکھنے کے لئے عارضی جگہ تھی۔ جسے جہانگیر نے سترہویں صدی میں نور جہاں کی خواہش پر اسے بہتر صورت دی۔ بیگم کی سرائے کا صحن ۳۳۱ مربع فٹ اور تین محرابوں والی چھوٹے گنبدوں سے آراستہ مسجد سے متصل ہے۔ صحن کے اطراف میں رہائشی کمرے بنے ہیں اور اس



گجرات فورٹ



اٹک فورٹ



اٹک فورٹ



قلعہ کوٹ ڈیجی



منجنیق



قلعہ حیدر آباد

کے چاروں کونوں میں پتھر کے مینار ایستادہ ہیں۔ یہ صحن مغلوں کے لئے راستے میں ستانے کی جگہ تھا۔ وہ جب واہ کے باغ کی طرف سفر کرتے یہاں منزل ہوتی۔ سرائے کے مغربی آخری حصہ میں کنواں ہے جہاں سے خفیہ سرنگ دریا تک جاتی ہے جہاں دو اور سرنگیں نکلتی ہیں یہ راستہ اعلیٰ انجینئرنگ کی مثال ہے۔ ۱۸۸۳ء تک یہاں کشتیوں کا پل تھا۔ ۱۸۸۰ء میں شروع ہونے والا پل ۱۸۸۳ء میں مکمل ہوا جو آج صوبہ سرحد کو صوبہ پنجاب سے ملاتا ہے۔

قلعہ شیخوپورہ

قلعہ شیخوپورہ نوٹیفیکیشن نمبر ایف 5-1/63Afm dt 11-4-196 کے تحت محفوظہ ہے جس کا رقبہ 64 کنال 13 مرلے ہے یہ قلعہ جہانگیر نے اپنی شکارگاہ میں 1015ھ میں تعمیر کرایا۔ اور اس نے اپنے جاگیردار سکندر معین کو حکم دیا کہ اپنے پرگنہ میں قلعہ تعمیر کرے۔ آج بھی یہ قلعہ شیخوپورہ آبادی کے جنوب مشرقی کونے میں موجود ہے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں یہاں رانی راج کور جسے رانی نائیکاں بھی کہا جاتا ہے کی رہائش رہی۔ اس جگہ آج بھی فریسکو پینٹنگ تازہ ہیں رانی جنداں جس کا سکھ حکومت کی سیاست میں گہرا عمل دخل تھا۔ اپنے خاوند کی موت کے چند سال بعد اس قلعہ میں قید کی گئی[128]۔ اس قلعہ کی بیرونی چاردیواری اور داخلی دروازہ کے علاوہ تمام عمارتیں سکھوں کی یادگار ہیں اگر حکومت پاکستان اس قلعہ کی سکھ میوزیم کا درجہ دے کر یہاں سکھوں کی یادگاریں محفوظ کرے تو یہ انتہائی زرمبادلہ کمانے کا ذریعہ ہوگا۔

عظیم تھل کا تاریخی شہر اور قلعہ منکیرہ

جھنگ سے ضلع بھکر اور اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان جاتے ہوئے تھل کے علاقے میں سڑک کے کنارے منکیرہ شہر سے گزر ہوتا ہے۔

ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے تھل منکیرہ کی تاریخ کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے جبکہ اس علاقے پر مصری، ایرانی اور یونانی حملہ آور مختلف ادوار میں قابض رہے۔ منکیرہ آج بے شک چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک معمولی شہراور ضلع بھکر کی تحصیل ہے لیکن کسی زمانے میں یہ عظیم ریاست کہلاتی تھی۔ جس میں کبھی موجودہ اضلاع میانوالی، خوشاب، جھنگ، بھکر، لیہ، مظفر گڑھ، ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں شامل تھے۔ یہ وہ سرزمین ہے جسے آریوں، مصریوں، ایرانیوں، یونانیوں، عربوں، راجپوتوں، بلوچوں اور پٹھانوں نے اپنے قلمرو میں شامل رکھا۔ لیکن ریاست منکیرہ کے کردار پر بہت کم مواد دستیاب یا محفوظ ہے۔ کچھ واقعات ملتان کے دامن میں الجھے ہوئے ہیں کچھ کو جھنگ اور دیگر علاقوں کی تاریخ سے وابستہ کردیا گیا۔ قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بھکر، کروڑ، منکیرہ اور حیدرآباد کے شہر زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں مگر عظیم تھل کی ریاست کا دار دارالسطنت ہمیشہ ہر دور میں منکیرہ ہی رہا۔ آخری مسلمان حکمرانوں سدوزئی پٹھانوں کے عہد حکومت میں ریاست منکیرہ کو کافی وسعت حاصل ہوئی۔ اس وقت اس کی حدود مشرق میں تریموں گھاٹ، دریائے جہلم، مغرب میں کلاچی، جنوب میں مظفر گڑھ اور شمال میں بنوں تک تھیں اور ریاست منکیرہ کا حکمران نواب سربلند خاں بہادر تھا جس نے قلعہ قدیم منکیرہ کے گرد وسیع وعریض قلعہ تعمیر کر کے محفوظ کردیا۔[129]

منکیرہ کی سرزمین، مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی امین ہے۔ یہاں کے اہم کھنڈرات کے اندر تاریخ کے بے پناہ دفینے پوشیدہ ہیں۔ کسی زمانے میں منکیرہ کی ریاست ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جسے مغلیہ دور حکومت میں ایک بفر سٹیٹ کی حیثیت حاصل رہی۔ طاس سندھ میں منکیرہ ایک قلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ درہ بولان اور درہ خیبر سے آنے والی حملہ آور قومیں منکیرہ سے گزر کر تریموں گھاٹ پر اپنا پڑاؤ ڈالتی تھیں۔ لاہور سے قندھار جانے والی سڑک پر واقع ہونے کی وجہ سے منکیرہ کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی۔ تریموں گھاٹ منکیرہ کی آخری سرحدی چوکی تھی۔

قدیم مورخین نے منکیرہ نام کے کسی شہر کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ سکندراعظم کے حملہ کے وقت مل کھیڑکوٹ نام کی ریاست تھی جس کا الحاق عظیم ریاست ملتان سے تھا۔ عرب مورخین اور تاجر اپنی عربی زبان کے لہجہ میں مان گیر کوٹ بولتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو ملوئی قبائل کے ایک راجہ مل کھیڑ نے آباد کیا۔ بعد میں یہ شہر منکیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 94ھ میں 713ء، میں محمد بن قاسم کی فوج کے سالا اعلیٰ ابوالاسود نے جب کروڑ، بھکر اور منکیرہ کو فتح کیا تو اس وقت یہ شہر مل کھیڑ کوٹ کی بجائے منکیرہ سے موسوم تھا۔ بعض کتابوں سے اس امر کے شواہد ملے ہیں کہ جب فوج کے راجہ بھٹ راجپوتوں نے عباسیوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر منکیرہ پر قبضہ کر لیا تو اسی خاندان کے ایک راجہ مانک رائے نے اپنے نام پر کوٹ مانک رائے کا شہر آباد کیا جو اور زمانہ سے منکیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ منکیرہ پر میکن قوم نے تقریباً پانچ سو سال تک حکومت کی۔ اس لئے میکنوں کے نام سے منکیرہ مشہور ہوا۔ بعض مقامی روایت کے مطابق جہاں اب منکیرہ شہر آباد ہے وہاں بارشی پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے ایک ٹوبھی تھی جس کے کنارے ریت کا ایک بڑا ٹیلہ تھا۔ آئے دن کی آندھیوں کی وجہ سے یہ ٹوبھی ہر وقت ریت سے اٹی رہتی تھی۔ اس لئے ریت کے گرنے کی وجہ سے من کیری ٹوبھی بھی مشہور ہوئی۔ سرائیکی زبان میں من ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اس کے اردگرد آبادیاں ہونے کہ وجہ سے منکیرہ مشہور ہوا۔

مورخین نے ٹھٹھہ، سیوستان، دیپال پور، اموری، مل کھیڑ کوٹ، ایسوری کوٹ، دین کوٹ خوشاب، بھیرہ اور بھکر کا تذکرہ اہم شہروں بلکہ بعض صوبوں کی حیثیت سے کیا ہے۔ مگر ان میں کوئی شہر سوائے ملتان کے مشہور نہیں۔ ہزاروں سال قبل جہاں جنگل وصحرا تھے۔ آج یہاں بارونق شہر آباد ہیں۔ منکیرہ کی قدیم تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ تاریخ ملتان کے مصنف بال کشن کا خیال ہے کہ بھٹی نام کا ایک راجہ جسلمیر کا حکمران تھا۔ اس کی نسل بھٹی راجپوت مشہور ہے جو جھنگ، ملتان، بھیرہ اور

منکیرہ پر چارسو برس تک حکمران رہی۔ بعدازاں اس علاقے میں ایرانیوں اور مصریوں کے حملے کے شواہد ملتے ہیں۔ سکندر اعظم جب دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے برصغیر کی طرف بڑھا تو 326 ق م میں درہ خیبر سے گزر کر چترال، سوات، باجوڑ اور پشاور کے علاقوں کو روندتا ہوا اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے ہنڈ تک پہنچا اور دریا عبور کر کے ٹیکسلا کی طرف بڑھا۔ اس کی فتوحات کے بعد ٹیکسلا سے سندھ تک کا علاقہ یونانی فوج کی تحویل میں آچکا تھا۔ بعد میں اس نے سرائے سدھو کی فوجی چھاؤنی میں عام اجلاس بلایا۔ اس میں اوچ، ملتان، شورکوٹ، چنیوٹ، منکیرہ اور بھیرہ تک کے حکمران بازیاب ہوئے اور وفاداری کی ضمانت پیش کی۔ لیکن سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس علاقے پر یونانی حکمرانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

صدیوں کے بعد جب برصغیر میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا تو اس کے اثرات منکیرہ اور اس کے نواحی علاقوں میں بھی پڑے۔ 985ء میں قنوج کے ناگ بھٹ راجپوتوں کی ایک شاخ میکن اقوام نے تھل کی عظیم ریاستوں امو الی منکیرہ پر حکومت کی۔ بعد کی تاریخ میں ہمیں حکمرانوں اور نوابوں کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جو منکیرہ اور اس کے علاقوں پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان میں زیادہ تعداد اُن حکمرانوں کی تھی جو کسی نہ کسی طرح دہلی کے حکمرانوں سے تعلق یا واسطہ رکھتے تھے یا ان کے نامزد کردہ تھے۔ اس تفصیل میں جانا مناسب نہیں ہوگا البتہ تاریخ کی کتب میں جو دلچسپ واقعہ محفوظ ہے وہ مشہور سیاح ابن بطوطہ کا منکیرہ کا دور تھا۔ ابن بطوطہ دریائے سندھ عبور کر کے 1334ء میں قصبہ داجل پہنچا پھر بھکر سے ہوتا ہوا منکیرہ آکر میکن راجدھانی میں ٹھہرا۔ پھر امو الی حیدر آباد سے ہوتا ہوا تریموں کے گھاٹ پہنچا۔ یہاں سے جھنگ آیا۔ اس زمانے میں جھنگ کا حکمران مبارک خان نول تھا۔ ابن بطوطہ اس کے ہاں ٹھہرا۔ حاکم نے اسے رخصت کرتے وقت دوشال اور ایک گھوڑا عطا کیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا کہ جب وہ ہندوستان پہنچا تو ملک میں زبردست قحط پڑا ہوا تھا۔ گندم



منکیرہ فورٹ



بھکر فورٹ



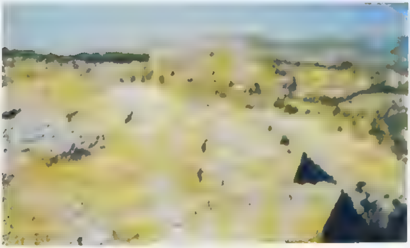
کلاں کوٹ فورٹ



بلتت فورٹ



جمرود فورٹ



گری فورٹ

روپے کی چار من فروخت ہو رہی تھی جبکہ عام حالت میں یہ روپے میں سات من بکتی تھی۔ فتح سندھ کے بعد یہ علاقہ براہ راست بغداد کی اموی حکومت کے تحت آ گیا۔ خلجی، تغلق عہد میں منکیرہ اور دیگر ریاستوں کے بارے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ کسی مورخ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ البتہ جب بلوچ اقوام نے منکیرہ پر قبضہ کیا تو 1480ء سے 1803ء تک یہاں حکومت کی اور یہ عہد منکیرہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ 1846ء میں انگریزوں کے ایک کمانڈر نے بھکر، حیدر آباد اور منکیرہ میں اپنا قبضہ مستحکم کر کے دریائے چناب عبور کیا۔ جنوری 1849ء سے 1947ء تک یہ علاقہ انگریزوں کے زیر تسلط رہا۔ انگریزوں نے 1848ء تک ریاست منکیرہ اور اس سے ملحقہ ذیلی ریاستوں کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے کر سکھ حکومت کے تمام کارندوں کو فارغ کر دیا تھا انگریزوں نے ریاستوں کی حد بندی ختم کر کے از سر نو مال گزاری کی شرح مقرر کی اور حیدر آباد، لیہ، بھکر، کلور کوٹ اور منکیرہ کو تحصیل کا درجہ دے کر ضلع جھنگ میں شامل کر دیا گیا۔ پنجاب پر قبضہ کے بعد انگریزوں کے دور ہیں۔ ریاست منکیرہ میں بسنے والی اقوام میں سے چھینے، بھڑوال، جھمٹ، شہانی، ڈھانڈلے، کہاوڑ، پٹھان اور بعض ہندو روسا کے نام کمشنر ملتان کو بھیجے جنہوں نے برطانوی حکومت سے وفاداری کا اعلان کیا۔ پھر جنوری 1857ء میں ریاست منکیرہ کے ان امرا کو لاہور میں چیف کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا جہاں اس نے ان خوشامدیوں کو جاگیریں عطا کیں اور رائے بہادر، خان بہادر، خان صاحب اور ملک وغیرہ کے خطابات دیئے۔ چنانچہ ان خوشامدیوں کے ذریعے انگریزوں نے ملک کا نظم ونسق چلایا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں جنگ آزادی زوروں پر تھی۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد ایک آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا تو ضلع بھکر کے اکثر دیہاتوں کی نسبت منکیرہ میں زیادہ مہاجرین آئے اور منکیرہ شہر کے عوام نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا اور انہیں آباد کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ یکم جولائی 1982ء سے بھکر کو ضلع کو درجہ دے دیا گیا

اب یہ تین تحصیلوں بھکر، منکیرہ اور کلورکوٹ پر مشتمل ہے۔
منکیرہ کے عوام جفاکش، زراعت پیشہ اور محنتی ہیں۔ یہاں کا زیادہ علاقہ ریتلے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن عوام نے اس صحرا سے بھی اپنی روزی پیدا کی ہے۔ چنا یہاں کی مشہور فصل ہے۔ یہاں آب پاشی کے وسائل ناکافی ہیں آبادی کم گنجان آباد ہے۔ اس لئے لاکھوں ایکٹر زمین بنجر اور بیابان پڑی ہے۔ اگر اس علاقے میں آب پاشی کا انتظام ٹھیک ہو گیا تو پاکستان کا سب سے زیادہ پیداواری خطہ کہلا سکتا ہے۔
بہر حال منکیرہ کے آثار قدیمہ اس کی تاریخی حیثیت کے مظہر ہیں اور یہ پیغام دے رہے ہیں۔ یہاں کے آثار قدیمہ میں قدیم قلعہ منکیرہ عوام کی دلچسپیوں کا مرکز ہے۔ دس ایکڑ پر محیط پر قلعہ 540 قبل مسیح میں مل قوم کے راجہ کھیڑہ نے تعمیر کیا تھا جس کا نام مل کھیر کوٹ تھا۔ عرب تاجر اور مورکن اپنی عربی زبان کے لہجہ میں اسے مانکیر کوٹ بولتے تھے۔ جو واقعات زمانہ کے ساتھ ساتھ منکیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 980ء میں امیر سبکتگین ملتان پر حملہ کرنے کے لئے یہاں سے گزرا تو اس قلعہ کی تعریف کی۔ 1380ء میں میکن حاکموں نے قلعہ کی دیواروں کو چاروں طرف سے 30 فٹ بلند کیا۔ اس کے ارد گرد خندق کھدوائی اور ایک کنواں قلعہ کے اندر بنوایا جو اب بھی موجود ہے اسے لوگ نور قلندر بادشاہ کا کنواں کہتے ہیں۔ ایک اور قلعہ نواب سر بلند خان نے 12 سال کی مدت میں بنوایا۔ یہاں مقبرہ نور قلندر بادشاہ بھی بہت مشہور ہے۔ جہاں مورخین کے مطابق اورنگ زیب کے حکم پر منکیرہ کے نواب میر بلوچ خان اول نے شہزادہ شجاع کو گرفتار کیا اور عالمگیر کے کہنے پر اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی اور عمر قید کی سزا سنا کر اسے قلعہ میں رکھا۔ شہزادہ شجاع اسی میں فوت ہوا اور عوام میں نور قلندر کے نام سے شہرت پائی۔ اس کا مقبرہ قلعہ قدیم منکیرہ میں ہے۔ اس طرح منکیرہ کے نواح میں گڑھ مہاراجہ، دلیوال، مبارک گڑھ، لیہ اور کوٹ ادو میں کئی قلعے خستہ حالت میں موجود ہیں۔
منکیرہ پنجاب کے ایک بڑے صحرا تھل کے عین وسط میں واقع ہے جھنگ بھکر روڈ شہر

کے درمیان سے گزرتا ہوا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ جھنگ بھکر روڈ سے چند سو گز جنوب میں یہ قلعہ واقع ہے۔ جس کی تعمیر کا کام ریاست منکیرہ پر مسلمانوں کے آخری فرمانروا نواب سر بلند خان سدوزئی نے 1804ء میں کیا۔ اس قلعہ کی تعمیر بارہ سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی قلعہ کی تعمیر کا کام مکمل ہونے کے بعد اس کے بانی نواب سر بلند خان انتقال کر گئے۔ یہ قلعہ کم وبیش پچاس ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے۔ قلعہ کے شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً چار دروازے اور اس کے ہر گوشہ میں ایک برج 45 فٹ سے زیادہ بلند ہیں قلعہ کی دیواروں کی بلندی بتیس فٹ اور موٹائی بیس فٹ سے زائد ہے ان دیواروں پر جگہ جگہ مورچے بنے ہوئے ہیں قلعہ کی بیرونی جانب چاروں اطراف ایک خندق تھی قلعہ سے باہر خندق کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ایک ایک کنواں تھا کل 12 کنویں تھے۔ جو خندق کو پر آب رکھنے کے لئے ہر وقت چلتے رہتے تھے۔ خندق کی چوڑائی چالیس فٹ اور گہرائی پندرہ فٹ تھی۔ قلعہ کے اندر جا بجا مکانات کے آثار موجود ہیں۔ قلعہ کے اندر جو درخت اور باغات تھے اور آج ناپید ہیں۔ سکھ دور حکومت میں دیوان لکھی مل نے اس قلعہ سے مسلمانوں کو نکال کر ہندوؤں کو آباد کیا اس قلعہ کے اندر ایک اور قدیم قلعہ موجود ہے۔ جو عمومی طور پر بلوچاں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قلعہ تقریباً دس ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔[130] 540 ق۔م میں مل قوم کے راجہ مل کھیڑہ نے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام مل کھیر کوٹ تھا۔ جسے عرب تاجر اور مورخین نے اپنے عربی لہجے میں نیکر کوٹ کہتے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منکیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 712ء میں محمد بن قاسم کے جرنیل ابوالاسود جیہم بن زحر ثقفی نے کوٹ کروڑ بھکر اور نیکر کو فتح کر کے احمد بن خزیمہ بن مدنی کو ان علاقوں کا گورنر مقرر کیا پھر شیخ حامد موسیٰ گورنر بنے جنہوں نے اس قدیم قلعہ کی تعمیر ومرمت کرائی پھر میکن قوم نے اپنے دور میں قلعہ منکیرہ کی مرمت کرائی۔

1380ء میں میکن افواج کا سالار اعلیٰ مہ پال نام کے شخص نے اسکی مرمت کرائی جو

میکنوں کے بعد لنگاہ، ہوت، میرانی، رند، جسکانی اور کلہوڑ بلوچوں نے یکے بعد دیگرے منکیرہ پر سوا تین سو سال تک حکمرانی کی اور قلعہ کی تعمیر و مرمت میں خصوصی دلچسپی لی۔ قلعہ کی چاروں اطراف بیس برج بنوائے گئے۔ نواب سر بلند خان نے 1804ء میں قلعہ منکیرہ کے اندر ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی یہ مسجد قلعہ بلوچاں کے باہر شمالی جانب اور قلعہ سر بلند خان کے اندر غربی سمت واقع ہے۔ 1821ء میں جب رنجیت سنگھ نے منکیرہ پر حملہ کیا تو اس نے منکیرہ سے دو کلومیٹر جنوب ایک اونچا تاریخی ٹیلہ لکی والا سے زمزمہ توپ سے گولہ داغ کر مسجد کا جنوبی مینار شہید کر دیا۔ مارچ 1816ء میں نواب سر بلند خان مرض اسہال میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔ نواب سر بلند خان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھانجے حافظ احمد خان اور نواسے شیر محمد خان ان کے جانشین مقرر ہوئے انہوں نے سر بلند خان کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ یہ مقبرہ قلعہ منکیرہ کے اندر جنوبی دیوار کے ساتھ ہے بعد ازاں جب رنجیت سنگھ نے ریاست منکیرہ پر قبضہ کر لیا تو نواب سر بلند خان کی مسجد کے چند گز کے فاصلے پر ہندوؤں کا مندر تعمیر کرایا۔ اور مسلمانوں کی عبادت پر پابندی لگا دی گئی۔ نواب کی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ وقت کے ساتھ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ منکیرہ کی دیواریں شکست و ریخت میں بدلنے لگی۔

قلعہ کسک

چواسیدن شاہ سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سڑک وٹلی گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ تقریباً 31 کلومیٹر کے فاصلہ پر رتو چھپڑ گاؤں سے آگے پہاڑوں کے دامن میں کسک نامی گاؤں آتا ہے جس کے شمال کی طرف پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ کسک دور سے دکھائی دیتا ہے قیام پاکستان سے قبل قلعہ کسک کو مرکزی حیثیت حاصل تھی یہاں کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی ہندو کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ قلعہ کے اندر ہندوؤں کی عبادت گاہ تعمیر کی گئی تھی قلعہ میں مقیم آبادی کے لئے دو تالاب بنائے گئے ہیں اس کے علاوہ کسک کی بستی کے

لئے کنواں تعمیر کیا گیا ہے۔ اب سارا گاؤں اس کنواں سے پانی حاصل کرتا ہے۔ مقامی آبادی سے گائیڈ کے بغیر قلعہ تک پہنچنا محال ہوتا ہے۔ قلعہ کے اندر رہائشی حصہ کی چھت غائب ہے۔ عین وسط میں ایک چبوترہ پر ہندوؤں کا مندر ہے جو صحیح حالت میں ہے۔ اندر تک جانے کے لئے بڑے بڑے پتھروں سے سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ مندر کے جنوب میں ایک تھڑا اور چار دیواری ہے آج کل پانی کے دونوں تالاب خشک ہیں قلعہ کی دیواریں سرخ پتھروں کو تراش کو چونا گچ سرخ مٹی سے تعمیر کی گئی ہیں قلعہ کے اندر خاردار جھاڑیاں جنگلی درخت اور پودے اُگے ہوئے ہیں۔

قلعہ کسک کے گردونواح میں جو قلعے ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ صاحبزادہ سلطان علی کے مطابق کوہستان نمک کے بالائی اور اترائی ہموار اور سطح مرتفع پر متعدد قلعے پائے جاتے ہیں۔ کچھ قلعے کھنڈرات کی شکل میں اب نابود ہو چکے ہیں ان علاقوں میں ڈیلی ہالہ، دیوار کرنگل کھیالہ، کسک، نندنہ، رہتاس، ملوٹ سمر قند، گٹھانوالہ اور شاہ کوٹ کے قلعوں کو نامکمل حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

قلعہ کسک کوہستان نمک کی جنوبی چوٹی پر واقع ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود اس کا محاصرہ کیا جنجوعہ سردار سلطان فتح محمد خان نے رنجیت سنگھ کا مقابلہ بہادری سے کیا۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہونے پر اس نے ہتھیار ڈال دیئے قلعہ کسک کا کل رقبہ تقریباً نصف میل کے لگ بھگ ہے جنوبی اور مشرقی دیواروں کی بلندی ۳۷۰ فٹ ہے۔ جانب شمال دو دروازے ہیں ایک اب گر چکا ہے۔ یہ قلعہ مقامی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ قلعہ کسک کے غربی حصہ میں تقریباً ۷۰ مکانات تعمیر کئے گئے ہیں جن میں سپاہ رہائش پذیر تھی۔ قلعہ کے درمیان ایک بنگلہ نما محل تھا جو بادشاہ یا حکمرانوں کے لئے مخصوص تھا پانی کے تالاب بارشوں کے موسم میں بھر جاتے لوگ یہ پانی پینے کے لئے استعمال کرتے غلہ سٹور کرنے کے لئے بھی مکانات بنائے گئے۔ قلعہ کی مضبوط بنیادوں اور اعلیٰ تعمیری ذوق کی وجہ سے قلعہ آج تک محفوظ ہے۔ [131] البتہ مشرقی جانب کی کونہ نما دیوار گر چکی ہے۔

1901ء تک اس کا صدر دروازہ چوبی محفوظ تھا جواب موجود نہیں، جنوبی ڈھلوان کی طرف اس کا دو راستوں سے رابطہ تھا سیدھا اوپر کی طرف سے اوپر نیچے تھے البتہ یہ راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔ جنوبی ڈھلوان کی طرف سے اگر اس قلعہ کی طرف سفر کر کے اوپر چڑھا جائے تو قریب پہنچ کر یہ قلعہ اچانک سامنے آجاتا ہے جلال الدین فیروز شاہ خلجی 95-1290ء نے بھی اسی علاقہ کے جنجوعوں کا بڑا خون بہایا۔ اس قلعہ پر امیر تیمور 1398ء میں حملہ آور ہوا تو کوہ جودہ کے راستے اور سردار پیش کش لے کر حاضر خدمت ہو گئے تو یوں یہ علاقہ تاراج ہونے سے بچ گیا قلعہ کسک کوہ جودہ کا شرقی اور آخری قلعہ تھا کوہ جودہ کلر کہار، ملوٹ اور کسک کے قلعوں میں شامل ایک علاقہ قرار دیا گیا تھا۔

قلعہ کرنگل

یہ قلعہ کسک کی جانب جنوب مغرب رکھ کرنگل کر سرے پر واقع تھا یہ قلعہ بھی مدافعتی سرگرمیوں کے لئے بنایا گیا اس قلعہ کا رقبہ ۴ مربع فرسنگ تھا اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گول محرابیں تھیں جن کے اوپر چھتری نما چھتیں تعمیر کی گئی تھیں خاندان غلاماں کے بادشاہ ناصر الدین محمود ۲۵۔۱۲۴۶ء کے عہد میں کرنگل کا قلعہ کا ذکر ملتا ہے اب یہ بوسیدہ ہو چکا ہے۔[132]

قلعہ ٹکھیالہ

ٹکھیالہ کی راجدھانی گرجا کھ کے عہد میں آج سے ۲۴۳۲ سال پہلے جب شری کٹاس راج سنسکرت زبان خردشتی زبان کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی یہ راجدھانی شکوہ وسطوت کے لحاظ سے عروج پر تھی۔ ٹکھیالہ کوہستان نمک جنوبی ڈھلوان سے ذرا زیادہ شمال کی جانب واقع ہے۔

قلعہ دیپالپور

قلعہ دیپالپور ملتان کے بعد غالباً برصغیر کا قدیم ترین قلعہ ہے۔ یہاں سے ملنے والے

پرانے سکوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ جگہ 175 ق۔م سے پہلے آباد تھی۔اس کی قدامت کی گواہی وہاں موجود شکستہ عمارات کے آثار دے رہے ہیں۔ایک روایت کے مطابق جب راجہ دیپا چند نے یہاں قبضہ کیا تو اس جگہ کا نام دیپالپور رکھ دیا تاریخ میں دیپالپور ایک سرحدی چوکی کی حیثیت سے مشہور ہوا جس نے تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں سلطنت کے دفاع میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ 1285ء میں بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان نے یہاں منگولوں کے خلاف ایک خونریز معرکہ لڑا اور شہید ہوا۔اس کا مزار آج بھی وہاں موجود ہے۔

''مغلیہ دور میں اس قصبے کو''سرکاری'' حیثیت حاصل تھی انگریزوں کے دورِ حکومت میں اس قصبے کی حیثیت ختم ہوکر رہ گئی۔دیپالپور میں موجود قلعے کو دیکھ کر اس کی قدامت کا اندازہ تو کیا سکتا ہے مگر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ کتنا قدیم ہے کیونکہ تاریخ میں یہ ذکر کہیں نہیں ملتا کہ یہ قلعہ کس نے اور کب تعمیر کروایا فیروز شاہ کے عہد حکومت اس قلعے کی تعمیر نو ہوئی اور اس کے گرد دفاعی خندق بھی کھودی گئی لیکن یہ شواہد کہیں نہیں مل سکے کہ اس کی تعمیر کا سہرا فیروز شاہ کے سر ہے۔

اس دور میں اس قلعے کی دیوار میں چوبیس برج تھے اور قلعے کے اندر چوبیس مساجد چوبیس تالاب اور چوبیس کنویں تھے۔چوبیس کے ہندسے کی اس قلعے سے کیا وابستگی اور اہمیت ہے اس سے متعلق بھی کہیں کوئی سند یا شہادت نہیں مل سکی۔ قلعے اور اس کے گردونواح میں پانی پہنچانے کے لئے دریائے ستلج سے ایک نہر نکالی گئی تھی جو قلعے کے گرد خندق کو پانی مہیا کرتی تھی۔یہ دیپالپور کا زریں دور تھا۔ قلعے کے اندر شاہی محلات اور جامع مسجد کے علاوہ زمین دوز سرنگیں کھودی گئیں۔جن کے ذریعے شاہ خاندان کے لوگ محلات سے باغات میں آتے جاتے تھے اب ان کا ذکر صرف تاریخ میں رہ گیا ہے یا وہاں کھنڈرات کی صورت میں یہ سب سوچ اور تخیل کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ قلعے کے چار دروازوں میں سے دو ابھی تک موجود ہیں اور زمانہ رفتہ کی شان وشوکت کی

گواہی دے رہے ہیں سرنگیں اور خندق بھر دی گئی ہیں البتہ چند مقامات پر وہ نشانات نظر آتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں خندق رہی ہوگی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مغل حکمران دہلی اور لاہور کے درمیان سفر کرتے تو دیپال پور ہی میں قیام کرتے۔[133]

اکثر کتابوں میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ 1518ء میں شہنشاہ اکبر اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کے ہمراہ جب حضرت بابا فرید گنج شکر کے دربار پر حاضری کے لئے آیا تو اس نے بھی دیپالپور میں ہی قیام کیا۔ یہ وہ دور تھا جب عبدالرحیم خان دیپالپور کا گورنر تھا گویا مغلیہ دور تک اس کی اہمیت برقرار رہی۔

دیپالپور میں ایک قدیم مندر سے ایک روایت بھی منسوب ہے کہا جاتا ہے کہ راجہ دیپا چند کے بیٹے لعل راج کو اس کی سوتیلی ماں رانی دھولراں نے بددعا دی کہ جاؤ تم زمین میں غرق ہو جاؤ۔ لعل راج ایک کم سن بچہ تھا۔ وہ کھڑا کھڑا زمین میں دھنسنا شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رانی پریشان ہو گئی اور اسے پکڑنا چاہا مگر رانی کے ہاتھ صرف بچے کے بال ہی آسکے۔ بچہ زمین میں زندہ دفن ہو گیا۔ راجہ دیپا چند کو علم ہوا تو اس نے رانی کو ہلاک کر دیا اور اپنے بیٹے کی یاد میں یہ مندر تعمیر کیا۔ اس مندر کا کھنڈر آج بھی موجود ہے۔ کسی زمانے میں یہاں میلہ لگا کرتا تھا اور آزادی کے بعد بھی ہندو اپنے بچوں کی منتیں پوری کرنے اور ان کے بال ترشوانے کے لئے یہاں آتے رہتے تھے۔ مگر اب یہاں کوئی نہیں آتا۔

چولستان کے قلعے

چولستان قدیم قلعوں اور چاردیواری سے مرصع شہروں سے بھرا پڑا ہے جو فوجی نقطہ نگاہ سے تعمیر کئے گئے ایک سروے کے مطابق بہت سے قلعوں کے آثار ملے جن کی تعداد 35 کے قریب ہے ان میں سے بعض کے قلعے جو نسبتاً اچھی حالت میں ہیں ان کی بابت

یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

قلعہ بارہ

یہ ایک مستطیل نما انیٹوں سے بنا قلعہ ہے جو پیائش میں 154 فٹ جنوبی سمت ہے اور اس کے برج گول ہیں ان میں سے جنوب مغربی کونہ کے برج اس کی اصلی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس کا محیط 26 فٹ ہے اس قلعہ کی حالت مخدوش ہے جب کہ گول نگہداشت کے لئے گول مینارا ابھی تک موجود ہے اور قلعہ کے باہر میٹھے پانی کا کنواں ہے۔

قلعہ بجنوٹ

قلعہ بجنوٹ یا ونجھورٹ ایک عدیم المثال قلعہ ہے جسے راجہ ونجھایا بھاٹیہ نے 757ء میں تعمیر کیا جسے شہاب الدین محمد غوری نے 1167ء میں تباہ و برباد کیا اب یہ قلعہ کھنڈرات کے شکل میں ہے مگر اس کے بیشتر حصے اچھی حالت میں ہیں یہ قلعہ چونے کے پتھروں کے ٹکڑوں سے بنایا گیا ہے اس کی چار دیواری تقریباً مربع ہے جو ہر طرف سے 300 فٹ ہے ایک کونے پر 28 محیط کا برج ہے ، جبکہ 3 برج قدرے گول جو کونے والے برج کے دونوں اطراف ہیں شمالی جانب 11 فٹ کھلا ایک داخلی راستہ ہے جس کے اوپر تین کمرے بنائے گئے ہیں۔ جن کی پیمائش "8 x "19 جن کی اونچائی 7 فٹ تک ہے۔

قلعہ کی دیواریں 21 فٹ تک بلند ہیں جس کے اوپر پردہ دیوار علیحدہ ہے اور دیوار کی کل چوڑائی اوپر سے 7 فٹ ہے اور بنیاد سے اور زیادہ چوڑی ہے شمالی دیوار کے اوپر 7 کمروں پر مشتمل داخلی راستہ کے مغرب میں ہے۔ جبکہ اس کی بیرونی چار دیواری میں ایک اور مربع چار دیواری ہے جس کی پیائش 155 فٹ لمبائی میں قدرے گولائی دار برجوں کے درمیان ہے یہ برج 30 فٹ کے محیط کے ہیں۔ اور دیواریں ½3 فٹ چوڑی ہیں۔ اور 10 فٹ تک بلند ہیں۔ اندرونی اور بیرونی دیوار کے درمیان ½52 فٹ کا فاصلہ ہے جبکہ اندرونی احاطہ کے داخلی رقبہ 8 فٹ کھلا راستہ ہے

شمالی جانب جس کا ایک بڑا صحن 62½ x 83 فٹ ہے پیائش میں ہے جس کا داخلی راستہ شمال کی جانب بیرونی چاردیواری کے قریب ہے۔
قلعہ کے اندر دو پانی کے تالاب ہیں جن کی پیائش 21 فٹ محیط میں ہیں اور 40 فٹ گہرے ہیں اس علاقے میں میتھاون مویشی باڑہ میں تھا جو آج کل فیروزہ نزد خانپور منتقل ہو چکا ہے۔

قلعہ جفا گلا

یہ قلعہ مٹی کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کی پیائش شمال سے جنوب کی جانب 128 فٹ اور مشرق سے مغرب کی طرف 192 فٹ اور 11½ داخلی راستہ جو شمال کی جانب ہے اس کی شمالی دیوار خمدار ہے اس کی بیرونی چاردیواری 7 فٹ موٹائی میں ہے اور کونوں پر بنے برج 91 فٹ تک بلند ہیں اور قلعہ کی عمارتوں کے کھنڈرات قلعہ کے اندر موجود ہیں یہ قلعہ 1767ء میں علی مراد خان پیر جانی نے تعمیر کرایا اس کے باہر میٹھے پانی کے چار کنویں موجود ہیں۔

دھوئیں والا قلعہ

یہ مٹی کی انیٹوں کا ایک چھوٹا قلعہ ہے جو مربع شکل میں ہے جس کے چار برج ہیں۔ جو 18 فٹ محیط میں ہیں اس قلعہ کے وسط میں مربع عمارات موجود ہیں جو کھنڈرات کی شکل میں ہیں اس کی بیرونی چاردیواری ختم ہو چکی ہے اب اس کی صرف 4 فٹ اونچائی تک دیوار ہی باقی بچی ہے۔ یہ قلعہ 1772ء میں عاقل خان ولد کبیر خان اجیران نے بنوایا تھا۔

خلجی قلعہ

منتھار سے 3 میل شمال کی جانب اس قلعہ کے آثار موجود ہیں جو مستطیل ہے جو 240 فٹ شمال سے جنوب کی جانب اور 160 فٹ مشرق سے مغربی جانب ہے جس کے

برج نہیں ہیں یہ کچی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جبکہ بیرونی چاردیواری پکی اینٹوں سے کی گئی ہے جبکہ شمال مشرقی سمت 16 فٹ اونچائی کے برج موجود ہیں یہ قلعہ مخدوش حالت میں ہے آج یہ ٹیلے کی شکل میں ہے اس کی اینٹ کا سائز "1.6 x 6 x 9 ہے۔

قلعہ اسلام گڑھ

قلعہ اسلام گڑھ یہ چولستان میں ہندوستانی سرحد کے قریب واقع ہے یہ قلعہ بجائے خود اینٹوں کی ایک خوبصورت عمارت ہے جس کی دیواریں اونچی اور مخروطی ہیں جنہیں مضبوط برجوں نے سہارا دے رکھا ہے یہاں میٹھے پانی کی موجودگی کی وجہ سے 1971ء تک آبادی قائم رہی۔

یہ قلعہ راول بھیم سنگھ نے 1608ء میں تعمیر کیا جسے بھیم دار کیا گیا 1766ء کے بعد اس پر گڑھی اختیار خان منڈ سائی سردار کا قبضہ ہو گیا پچھلے 100 سال میں قلعہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا یہ قلعہ مربع شکل میں 315 فٹ مشرق سے شمال کی جانب برجوں کے ساتھ دونوں اطراف سے شمال کی جانب 5 اور مشرقی جانب 8 اور کونے کے برجوں کے ساتھ موجود ہیں اور تین مغربی جانب اور جنوبی سمت ہیں۔ جو کہ 9 فٹ کے محیط میں ہیں اور دونوں کناروں پر برجوں کا محیط جنوب مشرق اور جنوب مغرب 50 فٹ تک ہے مگر جو مشرق اور شمال کی جانب ہیں وہ 39 اور 42 فٹ کے محیط میں ہیں۔ جبکہ بیرونی چاردیواری 10 سے 12 فٹ تک موٹائی میں ہے اور 45 فٹ تک اونچی ہے قلعہ کے اندر پہنچنے کے لئے مشرقی جانب ایک داخلی راستہ 9 فٹ کھلا ہے جس کے ساتھ دو برج تعمیر کئے گئے ہیں۔

داخلی راستہ قائمہ زاویہ پر مڑ کر مشرقی دیوار تک جاتا ہے اور اپنی چوڑائی کم کرتے کرتے 5 فٹ تک چلا جاتا ہے ایک چھوٹی مسجد ½28 x 49 مشرقی سمت میں واقع ہے نزدیک ہی ایک دوہری دیوار ہے جو ½4 فٹ محیط میں ہے جس کے بعد ایک اور دیوار ہے جو 11 فٹ محیط میں ہے شمال مغربی کونے میں مغربی دیوار کے اوپر کمروں کی ایک

قطار ہے دیوار کے باہر 130 فٹ گہرا کنواں جو 10 فٹ محیط کا ہے جس کی تعمیر پر 7½ x 5½ x 1 سائز کی اینٹیں لگائی گئی ہیں۔[134]

جام گڑھ

یہ پکی اینٹوں کا ایک خوبصورت قلعہ صحرائے چولستان میں ایستادہ ہے۔ یہ قلعہ 1788ء میں جام خان معروفانی نے تعمیر کرایا یہ مربع شکل میں ہے جو ہر طرف سے 114 فٹ ہے اس کی چار دیواری کی اونچائی 28 فٹ تک ہے جس کے کناروں پر گول برج ہیں۔ جو 31 سے 35 فٹ پر محیط ہیں اس کا داخلی محرابی راستہ ہے جو 9 فٹ وسیع ہے جو مشرقی دیوار میں سے قلعہ کے اطراف میں مٹی کو دیواروں سے ساتھ لگایا گیا ہے۔

قلعہ کنڈیرا

یہ قلعہ کچی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جبکہ اس کا ماتھا اور دونوں اطراف پکی اینٹیں لگائی گئی ہیں یہ قلعہ فضل خان ولد بھکر خان بیر جان نے 1754ء میں تعمیر کیا جسے محمد بہاول خان دوم نے 1805ء میں تباہ کیا۔ آج یہاں کچی اینٹوں کی ایک چار دیواری ہے جو مربع شکل میں ہے اس کی پیمائش 162 فٹ ہر طرف سے برجوں کی پیمائش اس کے علاوہ ہے جو دونوں اطراف 21 فٹ محیط میں ہیں جو برج شمال مشرقی اور جنوب مشرقی سمت میں ہیں ان کی بلندی 21 فٹ تک ہے اس کی چار دیواری 8 فٹ تک چوڑی ہے جو پکی اینٹوں کے علاوہ ہے جبکہ دوسرے برج 2½ فٹ ہوتے ہیں جبکہ کچھ برج آج موجود نہیں ہیں اس کی پختہ اینٹوں کی کا سائز 1½ x 6 x 9 ہے قلعہ کے ارد گرد جنگلی پودوں کی افزائش سے عمارت کو مناسب نمی مل رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کبھی میٹھا پانی تھا۔

قلعہ خیر گڑھ

ضلع بہاولپور بھٹہ شیخاں کے جنوب مشرقی جانب 12 میل کے فاصلہ پر خیر گڑھ

قلعہ ہے جسے اختیار خان نے 1775ء میں مٹی کی اینٹوں اور پکی اینٹوں سے تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ مربع شکل کا ہے جو 170 فٹ اندرونی سائیڈ سے اور اس کے برج ہشت پہلو ہیں اور مٹی کی اینٹوں کی چار دیواری جو اوپر سے 8 فٹ چوڑی اور 24 فٹ اونچی اور مزید 5 فٹ پردہ دیوار ہے اس کے برج 46 فٹ محیط میں ہیں۔ جس میں 1½ موٹی پکی ہوئی اینٹوں کی دیوار بھی ہے جبکہ برجوں کے اندرونی اطراف چھت والے کمرے ہیں جو 19 فٹ محیط کے ہیں جو اوپر جانے کا راستہ ہموار کرتے ہیں اس قلعہ کا دروازہ مشرقی دیوار میں نمایاں ہے جبکہ داخلی دروازہ دو برجوں کے درمیان ہے جہاں ایک دیوار احاطہ سے پہنچا جا سکتا ہے داخلی دروازہ 6 فٹ کھلا ہے جس کے اندرونی سمت دو مستطیل کمرے ہیں قلعہ کے اندرونی جانب ایک چڑھائی دار راستہ قلعہ کی چھت تک جاتا ہے یہاں چند کمرے تعمیر کئے گئے ہیں جو شمال اور مغربی دیوار کیساتھ ہیں شمال مغربی کونہ کے باہر ایک پرانا کنواں ہے جس کی اینٹ کا سائز "15 x 6 x 95 ہے۔

قلعہ خان گڑھ

یہ قلعہ نواب محمد بہاول خان دوم نے 1783ء میں تعمیر کیا جو مربع شکل میں ہے جس کے ہر کونہ میں قدرے گول برج تعمیر کئے گئے ہیں یہ ہر طرف سے 128 فٹ ہے دیوار اور برج جو کچی اینٹوں سے تعمیر کئے گئے ہیں اور سامنے کے حصے پر پکی اینٹیں لگائی گئی ہیں جو اب گر چکی ہیں۔ اب صرف نشان رہ گئے ہیں اس کی دیوار 10 فٹ چوڑی اور پکی اینٹ کا سائز 1½ x 6 x 8½ ہے۔ تیسرے شمال مغربی کونہ میں ایک مربع مینار پکی اینٹوں سے بنایا گیا ہے اور جنوب مشرقی جانب سے 80 فٹ کے فاصلہ پر اینٹوں کا بھٹہ ہے۔

قلعہ لاتیرا

یہ قلعہ 1780ء میں بزل خان نے بنوایا جسے سیلاب نے 1804ء میں تباہ کر دیا یہ مربع شکل کا قلعہ ہے جو مٹی کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ شمال سے جنوب کی

طرف 121 جبکہ مشرق سے مغرب کی طرف 112 فٹ ہے اور اس کے درمیان برج استادہ ہیں۔

اب مشرقی دیوار کی موٹائی 8 فٹ تک ہے جہاں ایک دروازہ بھی ہے اب یہاں 24 فٹ کا ایک راستہ ہے جو پکی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ جنوبی سمت والی دیوار جو 21 فٹ اونچی ہے جبکہ اندرونی طرف سے یہ 16 فٹ اونچی ہے۔ اس کے کناروں کے برج 42 فٹ محیط کے ہیں اور 42 فٹ سے بھی اونچے ہیں ماسوائے ایک کے جو جنوب مغربی سمت واقع ہے اور اب کھنڈر کی صورت میں ہے پردہ دیوار تک پہنچنے کے لئے 4 فٹ کھلا محرابی راستہ ہے اور ان برجوں میں جانے کے لیے 16 x 14 فٹ کی سیڑھیاں ہیں یہاں کبھی دیوار بھی موجود تھی۔

قلعہ چکی

پکی اینٹوں سے بنا یہ قلعہ لال خان ولد اختیار خان کہرانی نے 1777ء میں بنوایا۔ کونے کے برجوں کے درمیان اس کی پیمائش 125 فٹ ہے جس کی دیوار 6 فٹ چوڑی اور 18 فٹ اونچی ہے اور کونوں کے برج 42 فٹ کے محیط ہیں اور 40 فٹ اونچے ہیں قلعے تک رسائی مشرقی دیوار سے مہیا کی گئی ہے جہاں ½19 فٹ محیط کے برج بنائے گئے ہیں اور داخلی راستہ 8 فٹ ہے جس کے ساتھ کمرے موجود ہیں۔ کونے والے برج تباہ ہو چکے ہیں جہاں 3 فٹ چوڑے سیڑھیوں کے ایک راستے سے پہنچا جا سکتا ہے اوپر 15 فٹ محیط کے کمرے موجود ہیں۔

قلعہ مروٹ

کسی وقت مروٹ ایک مصروف تجارتی کاروباری مرکز تھا جو ملتان اور دہلی کے درمیان واقع ہے جہاں سرسہ اور ہانسی عہد وسطٰی میں جاتا تھا قلعہ مروٹ کے موجودہ کھنڈرات روایات کے مطابق اسلام سے قبل چتوڑ کے حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ یہاں مذہبی

عمارت کی بھرمار ہے جن میں منادر اور تراشیدہ ستون جو زرد ریتلے پتھر سے بنائے گئے جو اس وقت بہاولپور میوزیم کی زینت ہیں۔

12 ویں صدی عیسوی میں مروٹ نہ صرف تجارتی مرکز بلکہ فوجی نقطہ نگاہ سے بھی اک اہم چیک پوسٹ رہی اُچ کا حکمران ناصر الدین قباچہ کچھ عرصہ اس جگہ رکا۔ 1250ء معروف مورخ منہاج سراج بھی یہاں آیا۔ اکبری دور میں 200 گھڑ سوار اور 1000 پیدل سپاہی موجود تھے ابوالفضل کے مطابق 54560 بیگھہ زمین اس قلعہ کے ماتحت تھی جس کی سالانہ آمدنی 204000 سکہ تھی ایک چھوٹی مسجد 26 x 20 فٹ موجود ہے جسے محمد طاہر نے بنوایا یہاں فارسی کتبہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد اکبری زمانہ 976ھ/1568ء میں بنائی جواب تک موجود ہے۔

مروٹ قلعہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے پاس رہا۔ نواب مبارک خان نے اسے جیسلمیر کے راجہ سے 18 ویں صدی میں لیا۔ 1842ء میں چارلس میسن نے اپنے سفر افغانستان اور پنجاب کے دوران مروٹ کو بھی دیکھا جو اُس وقت ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ آج یہ قلعہ کھنڈرات کی شکل میں ہے اور اس کا بیشتر حصہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے یہ مربع شکل کا قلعہ ہے جو جنوبی سمت 464 فٹ اور 820 فٹ مغربی سمت سے ہے اس کے دو موجود برج جنوب مغربی سمت اور شمال مشرقی سمت میں جو 30 فٹ محیط کے ہیں اور مغربی سمت میں دیواروں کی اونچائی 89 فٹ ہے اس کی بیرونی چار دیواری میں استعمال ہونے والی اینٹوں کا سائز 2 x 8 x 12½ اور 1/4 5 x 8 x 1 1/4 ہے۔

قلعہ میر گڑھ

یہ قلعہ نور محمد خان ولد جان خان نے 1799ء میں بنایا جو 3 سال کی مدت میں مکمل ہوا یہ شخص اُچ کے گیلان مخدوم کا شاگرد تھا جب کہ قلعہ کے دروازہ 1872ء کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے یہ قلعہ پکی اینٹوں سے جن کا سائز 1½ x 6 x 9½۔ یہ ایک مربع شکل کا

قلعہ ہے جو ہر طرف سے 92 فٹ ہے اور داخلی دروازہ کے دو برج ملا کر کل سات برج ہیں جن کا محیط 38 فٹ ہے اور یہ 39 فٹ اونچے ہیں۔ مشرقی سمت میں 9½ کا داخلی راستہ ہے جو 47 فٹ تک ہے اور اس پر کمرے جن کی چھت گنبد کی طرح تھا اس کے اردگرد ابھی بھی مٹی پڑی ہے۔ قلعہ کے اندر ایک کنواں ہے جواب بھر چکا ہے اور اس کے علاوہ قلعہ کے باہر 6 کنویں موجود ہیں جن میں میٹھا پانی موجود ہے۔

قلعہ موج گڑھ

قلعہ موج گڑھ 1743ء میں محمد معروف خان کہرانی نے بنایا، اس کا مقبرہ مربع شکل میں ٹائیلوں سے مزین ہے جس کے اوپر گنبد ہے جو قلعہ سے 400 گز جنوب کی طرف واقع ہے قلعہ کی تعمیر معروف خان کے بیٹے اور جانشین جان محمد خان کے زمانہ 1757ء میں ہوئی۔ لوہے کے مضبوط ٹکڑے قلعہ کے دروازہ پر لگائے گئے تھے جن میں سے ایک پر قلعہ کی تاریخ بنا فارسی میں 1797ء-1212ھ درج ہے اور اس کے بنانے والے کا نام سری رام لوہار درج ہے یہ قلعہ الفنس اور میسن نے بھی دیکھا۔

آج قلعہ انتہائی مخدوش حالت میں ہے اور ماتھے پر لگی پکی اینٹیں اپنی جگہ چھوڑ چکی ہیں اور اس کا میٹریل مقامی لوگ اپنی تعمیرات میں لگا رہے ہیں مربع شکل کے اس قلعہ کی پیمائش 238,312,325 فٹ جنوبی مغربی اور شمالی سمت سے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک ہے۔ اس کے شمال مشرقی حصے میں ایک ٹوبہ ہے جہاں سے مقامی لوگ پانی پیتے ہیں۔

قلعہ کی دیوار کی مضبوطی کے لئے قدرے گول برج بنانے کے لئے ان میں سے آٹھ شمالاً جنوباً دروازے کے برجوں کو چھوڑ کر بنائے گئے ہیں اسی طرح مغربی سمت کے برج دروازوں کے برج کو شامل کر کے آٹھ بنتے ہیں ان برجوں کا محیط 40 سے 48 فٹ تک ہے۔

مشرقی سمت 10 فٹ کھلا ایک داخلی محرابی راستہ ہے جو 72 فٹ لمبی ایک راہداری سے جڑا ہے جو قلعہ کی جنوب مشرقی سمت سے آتا ہے اس کے ساتھ بھی ایک مسجد x 54½

33 فٹ کی ہے قلعہ کی اندرونی طرف چار دیواری گر چکی ہے جس سے اب مٹی کی اینٹیں نظر آتی ہیں۔

قلعہ مرید

یہ قلعہ مربع شکل میں ہے جو اندر سے 87 فٹ ہے اور اس کے کونوں پر 4 برج ہیں۔ جن کا محیط 18 فٹ تک ہے اور اس کی دیواریں 7 فٹ موٹی ہیں اور 8 فٹ تک اونچائی میں ہیں اور 13 فٹ کھلا داخلی راستہ جنوبی سمت سے قلعہ کے اندر جاتا ہے یہ قلعہ حاجی خان ولد اختیار خان نے 1777ء میں بنایا جو سیلاب کی وجہ سے 1805ء میں تباہ ہوا۔

قلعہ نواں کوٹ

یہ قلعہ دریائے ہاکڑہ کی گزرگاہ پر واقع ہے جو ابھی کچھ اصل حالت میں ہے۔ قلعہ مٹی کی اینٹوں سے بنایا گیا جس کے چاروں کونوں پر مینار بنائے گئے باہر سے 156 فٹ برجوں کے اندر ہے جس کی دیواریں 10 فٹ چوڑی اور اس کے اوپر پردہ دیوار ہے جو ایک فٹ چوڑی ہے کونے کے برج 45 فٹ محیط کے ہیں جو ½16 فٹ محیط کے کمروں پر مشتمل ہیں۔ پانچ کمروں کی قطار قلعہ کے وسط میں مغربی دیوار کے قریب تعمیر کی گئی ہیں۔
شمال کی جانب سے 10 فٹ وسیع داخلی دروازہ ہے جو سپاہیوں کے لئے ہے اور پکی اینٹوں کی تعمیر ہے یہاں قلعہ کے اردگرد ایک بیرونی دیوار بھی ہے جو 225 فٹ دور تھی جس کے آثار ہی اب نظر آتے ہیں۔

قلعہ پھلرا

قلعہ پھلرا کے آثار فورٹ عباس سے جنوب کی سمت ایک میل کے فاصلہ پر ہیں۔ فورٹ عباس اسی قلعہ کے میٹریل سے بنایا گیا اب پرانے قلعہ کا وہاں کچھ نہیں بچا یہ قلعہ روایتی طور پر لاکھ پھلائی سے منسوب کیا گیا ہے جبکہ ایک مٹی کی عمومی دیوار جو موجودہ کھنڈرات سے شمال مشرق سمت جاتی ہے پھلرا قلعہ کی نشاندہی ہو سکتی ہے موجود حالت انتہائی

مخدوش ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کرم خان اربانی ولد قاسم خان قائم پور کے دور میں 1752ء میں ہوئی۔ یہ قلعہ مربع شکل میں ہے جس کے کونوں پر برج ہیں جو شمالی سمت میں ہیں وہ ہشت پہلو برج میں شمال مشرق سمت کے کونوں میں تباہ شدہ 3 منزلہ محلات کے آثار ہیں۔ جن پر اب بھی لکڑی کا کام بچا ہوا ہے اس کے ساتھ اینٹوں کا ایک پختہ مینار ہے جو اچھی حالت میں ہے۔

قلعہ ہڑند

تاریخی قلعہ ہڑند ضلع ڈیرہ غازی خان میں قصبہ جام پور کے مغرب میں 58 کلومیٹر پر کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ پنجاب کے جنوب مغربی سرحد کے ساتھ اس سلسلہ پر تین مشہور گزرگاہیں چاچڑ، کاہا، درگاہیں ہیں۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے جسے کاہا نہر سیراب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ واحد مشہور میٹھے پانی کا ذریعہ ندی ہے جو کہ سندھ اور کوہ سلیمان کے درمیان تونسہ سے سندھ کے بارڈر پر بہتا ہے۔[136]

یہ قلعہ بڑے ٹیلے پر بنایا گیا ہے جو کبھی نامعلوم لوگوں کی رہائش گاہ تھی۔ مقامی لوگ اس قدیم جگہ کو یونانی، تباہ کاری سے ملاتے ہیں اور اسی لئے اس کا نام ہاری سے لیا گیا ہے جو کہ سکندر اعظم کا غلام تھا مقامی روایات کے مطابق اس قلعہ کی تعمیر کا حکم بادشاہ جہانگیر نے دیا تھا اور قلعہ کا موجودہ ڈھانچہ قدیم مغل دور کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس علاقہ کے برطانوی ڈپٹی کمشنر کیپٹن سنڈیمین کو ایک مرتبہ برکھان سے کتبے ملے جن پر شہنشاہ جہانگیر کے قیام کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ اس نے دہلی سے قندھار جاتے ہوئے یہاں پر نماز ادا کی تھی۔[137]

مسٹر بروش ہڑند قلعہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ صدیوں پہلے جب مسلمانوں نے پہلا حملہ کیا تھا تو اسی وقت صرف تین قصبے ہڑند، مادی اور ایسی تھے۔

ہڑند کا قصبہ ملتان کے راجہ ہرنکس وائٹ کے پاس تھا جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پارلڈ تخت نشین ہوا جس کا مزار ملتان میں آج بھی ہے اٹھارویں صدی کے وسط میں ہڑند اور اس

کے اردگرد کے علاقے میں گورجانی اور بٹی لنڈ قبائل آباد تھے۔ تیمور شاہ درانی نے 1758ء میں یہ قلعہ ناصر خان بروہی خان آف قلات کو دے دیا۔ یہ اُسی وقت تک اسی کے پاس رہا جب تک نواب بہاولپور نے 1827ء میں یہ قلعہ سکھوں کو سونپ دیا۔ 1836ء میں ساون مل نے اِسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ 1849ء میں سکھوں کی شکست کے بعد قلعہ پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔ 1867ء کو قلعہ پر بگٹی قبیلہ نے حملہ کیا جو کیا گورجانی اور بٹی لنڈ قبیلہ نے بڑی فوج کے ذریعے اُن کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ یہ قلعہ شہکار ہے قدرے بیضوی ہے جس کی پیمائش مشرق مغرب کی طرف 350 میٹر اور شمال جنوب کی طرف 310 میٹر ہے۔ یہ پکی اینٹوں سے بنایا گیا ہے اینٹ کا سائز 11/4x6x9 دیوار کی چوڑائی 7 فٹ ہے اور پھر اسی کو برجوں سے اور زیادہ مضبوط کیا گیا ہے۔ برج کے نوکونے ہیں جن پر توپیں رکھنے کی جگہ ہے قلعے کے صرف دو داخلی دروازے ہیں۔

بڑا داخلی دروازہ مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ہے۔ سامنے والی دفاعی دیوار کی موجودہ بلندی 22 فٹ ہے۔ دوسری طرف مغرب دروازہ تراشی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کے دو گنبد اور سامنے سے چوکور ہے۔

قلعے کے اندر پرانی پہاڑی ہے جس کی بلندی 20 سے 25 فٹ ہے ساتھ والی زمین سے پہاڑی دفاعی دیوار کے اندر نہیں آتی بلکہ قلعہ کی مقامی آبادی نے قلعہ کی اینٹوں سے بھی اپنے گھر تعمیر کیے ہیں قلعہ کے اندر ایک قدیم ٹیلہ 25 x 20 فٹ کا ہے۔ یہ ٹیلہ صرف قلعہ کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں بلکہ شمالی مشرقی طرف سے قلعہ کے باہر تک نکل گیا ہے اور اس کا بڑا حصہ کسانوں کو زراعت کے لئے کرائے پر دیا ہے۔ اس ٹیلہ پر بڑی تعداد میں ٹھیکریاں پائی جاتی ہیں۔

قلعہ ملتان

شہر کی طرح ملتان کے قلعہ کی تاریخ بھی گوشہ گمنامی میں ہے کہا جاتا ہے کہ مگر اس کا بین ثبوت نہیں کہ ملتان کا نام ملوئی تھا۔ جس کی بلند فصیل کو سر کرتے ہوئے سکندر کو مہلک زخم آئے۔ ملوئی کو ہی ملتان سے منسوب کیا گیا۔ تاریخی حوالوں میں اس کا تذکرہ

چچ نامہ 7ویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ جب یہ راجہ چچ کے ماتحت تھا۔ ملتان شہر کے مختلف نام تاریخی حوالوں میں ملتے ہیں۔ البیرونی نے اسے مل استھانہ جسے المعمورہ بھی کہتے ہیں۔ البیرونی نے 11ویں صدی عیسوی میں اس کے نام کے بارے میں لکھا۔ کہ بہت سے ممالک کے نام جو آج ہیں ان میں اصل نام کچھ اور ہیں۔ اتپالہ مقامی کشمیری اپنی کتاب سمہتا میں لکھتا ہے کہ ملکوں کے نام کیسایہ پورہ پھر ہمساپورہ پھر باگاہ پورہ پھر سمبھا پورہ اور پھر مل استھانہ جہاں مل کا مطلب راستہ ہے اور استھانہ کا مطلب جگہ۔ جبکہ ایک اور قول کے مطابق ملاترنگ یا ملاتران ہے۔

قلعہ ملتان ایک اونچے ٹیلہ پر واقع ہے جبکہ اس کے وسط میں آج کل شہری آبادی ہے شہر اور قلعہ کے درمیانی گھاٹی دریائے راوی کی پرانی گزرگاہ ہے آج تک اس کی باقاعدہ تحقیق نہیں ہو سکی اس کی تاریخ کے بارے ہم آج تک سر الیگزینڈر کننگھم 1853ء کی مہیا کردہ معلومات پر اکتفا کر سکتے ہیں۔[139] جس سے اس کی تاریخ بنا 800 قبل مسیح دی ہے اور 326 ق م میں سکندر اور پھر 712ء میں محمد بن قاسم کے فتح کرنے کے متعلق بھی معلومات دی ہیں۔

قلعہ کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ 2000 میٹر میں پھیلے ہوئے ہیں جو 2 کلومیٹر سے زائد ہیں اور اس کے 46 برج اور چار دیواری تھی اور قلعہ کے چار دروازے برجوں میں چھپے ہوئے تھے جہاں مکمل سکیورٹی تھی۔ مغربی جانب کا دروازہ جواب سائرین کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کا نام ڈیہ یا دلیہ تھا کننگھم کے مطابق دیول کے نام پر تھا جو کہ قلعہ کے اندر ایک مندر ہے۔ مغربی گیٹ کے پاس پانی بہتا تھا۔ تیسرا دروازہ جنوب مشرقی سمت میں ہے جسے سکھی دروازہ اردگرد کے علاقہ کی نسبت سے کہا جاتا ہے جبکہ چوتھا اور آخری دروازہ حسین آگاہی یا ریڑھی اس طرف گہری کھائی کی وجہ سے دیا گیا۔ جبکہ دو آخری دروازے ختم ہو چکے ہیں جن کے اب آثار بھی موجود ہیں۔

قلعہ کی پرانی عمارات میں سورج دیوتا کا مندر ہے اگرچہ اس کے نشانات نہیں چچ نامہ میں پہلی دفعہ یہ بتایا گیا ہے کہ ملتان کے فتح ہونے کی وجہ کیا ہے چچ لکھتا ہے کہ جب ملتان کا قلعہ لیا گیا چچ نے وہاں ٹھاکر (راجپوت) اپنے نمائندہ کے طور پر بٹھایا اور وہ خود بتخانہ میں چلا گیا جو شورزدہ زمین پر کھڑا تھا اس نے خود کو بت کے سامنے جھکا دی اور قربانی پیش کی پھر اس نے اپنا سفر شروع کیا۔

البیرونی اس بت کے بارے لکھتا ہے کہ ملتان کا مشہور بت جس کا نام سورج کے نام پر تھا جسے ادیتہ کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر چمڑا مڑھا ہوا تھا اس کی دونوں آنکھوں میں یاقوت جڑے تھے۔

یہ زمانہ وہ ہے جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تھا تو اس نے دریافت کیا کہ یہ شہر اتنا خوشحال ہے یہاں بہت سے خزانے ہیں تب اسے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ بت ہے تمام علاقوں سے لوگ اس بت کی پرستش کو آتے۔ اسی جگہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی جب قرامطیوں نے ملتان پر قبضہ کیا۔جلم ابن شیبان نے اس بت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کے پجاریوں کو قتل کر دیا اور پرانی مسجد کی جگہ نئی مسجد تعمیر کرائی۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے قرامطیوں کے اقتدار کا خاتمہ ملتان سے کیا اس نے قرامطیوں کی مسجد کو ختم کر کے یہاں دوبارہ مسجد جمعہ تعمیر کی۔

مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ نے اس مندر کے بارے 641ء میں لکھا اور یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ جب 1666ء میں یورپین سیاح بھتونٹ نے اسی جگہ کا ملاحظہ کیا۔ اس مندر کو عالمگیر نے بھی تباہ کیا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کر دی بعد میں سکھوں نے 19 ویں صدی کے وسط میں یہاں اپنا بارود خانہ قائم کیا۔ 1848ء میں یہ جگہ برطانوی افواج کے زیر استعمال رہیں اس کے کھنڈرات کا مشاہدہ کننگھم نے 73-1872ء میں کیا جب یہ قلعہ کے وسط میں تھی۔

قلعہ میں قابل ذکر عمارت شیخ رکن عالم کا مقبرہ ہے جو ملتان کے مقبروں کی ایک

نمائندہ مثال ہے۔ یہ فن تعمیر تغلق دور کا خاصہ ہے۔ حضرت رکن عالم کے پوتے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی 1251ء میں پیدا ہوئے اور 60 سال کی عمر میں اپنے دادا کی سہروردی گدی کے وارث ہوئے آپ اپنے زمانہ کے جدید عالم اور سیاسی طور پر تغلق حکمرانوں پر اثر رسوخ رکھتے تھے آپ نے یہاں خانقاہ اور مدرسہ قائم کیا جب ابن بطوطہ نے 1334ء میں ملتان کا سفر کیا تو کچھ عرصہ شیخ کے ساتھ رہا۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتان اسی سال یعنی 1334ء میں وفات پا گئے اور اپنے دادا کے روضہ میں دفن کئے گئے۔ جہاں وہ اس عظیم الشان مقبرہ میں دفن ہوئے جسے سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنی زندگی میں اپنے لئے 1320ء سے 1324ء تک تعمیر کرایا تھا جسے بعد میں اس نے محمد تغلق کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ یہاں اس عظیم بزرگ کو دفن کرے۔ قرائن گواہ ہیں کہ اس نے اپنے لئے تغلق آباد میں ایک عظیم مقبرہ تعمیر کرایا جہاں اب وہ دفن ہے۔

خیبر پختونخواہ کے قلعے

قلعہ بالا حصار

راولپنڈی کی طرف سے پشاور میں داخل ہوتے ہوئے اس قلعہ کا نظارہ ہر کوئی کرسکتا ہے۔ یہ قلعہ کی چار دیواری 220 x 220 سائز میں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے [140] جبکہ بیرونی دیوار اندرونی دیوار سے نیچی ہے دیوار میں متناسب فاصلہ پر برج تعمیر کئے گئے ہیں۔ شمال کی جانب ایک داخلی دروازہ ہے جو سڑک سے نظر آتا ہے قلعہ کے اندر چند بیرکوں کے ساتھ ساتھ رہائشی عمارات ہیں قلعہ کی تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے دفاعی مقاصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ قلعہ کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس قلعہ نے مغلوں کے دور کے عروج وزوال دیکھے حتیٰ کہ یہ قلعہ درانیوں کے قبضہ میں آ گیا جسے سکھوں نے تباہ وبرباد کیا۔ سردار ہری سنگھ نلوا نے اسے نوشہرہ کی جنگ کے بعد مرمت کیا مگر بعض مورخین کے مطابق اسے کھڑک سنگھ کے زمانہ میں مرتب کیا گیا۔ جبکہ میجر ریورٹی لکھتا ہے کہ یہ قلعہ رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ نے اپنے باپ کے حکم سے تعمیر کرایا[141]۔ بعد میں برطانوی افواج نے اس کی کچھ دیواروں پختہ اینٹوں سے تعمیر کردی قلعہ کے داخلی دروازہ کے اوپر ایک کتبہ لگا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کی سری اکال کی مدد سے پرکھ کی فتح مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی حکومت کے تحت 1834-1891ء بکرمی سمت اس بات کی شاہدہیکہ یہ قلعہ بکرماجیت نے تعمیر کرایا اور اسے سمرگڑھ کا نام دیا۔ قلعہ بالا حصار کی خوبصورتی اس وقت قابلِ دید تھی جب شاہ شجاع یہاں روز آتا تھا اس کے حالات ایلفنٹس نے رقم کئے۔ جب اس کی ملاقات شاہ شجاع سے سرفلفہ میں ہوئی تھی۔ اس کا نقشہ اس نے 1809ئمیں خوب کھینچا ہے۔[142]

بعض مورخین رقمطراز ہیں کہ قلعہ بالا حصار مغل شہنشاہ بابر نے بنوایا تھا مگر اس کو کوئی بین ثبوت نہیں تزک بابری کے مطابق بابر نے صرف اس قلعے کو مضبوط کیا۔ یہ ممکن ہے کہ جب چینی سیاح هیون تسانگ یہاں سے گزرا اس نے باڑہ دریا کے گردونواح میں بالا حصار کو دیکھا ہو۔ سارے علاقے میں یہ قلعہ ایک بلند جگہ پر واقع ہے جو ہر سیاح کے لئے ایک کشش رکھتا ہے۔

قلعہ ھنڈ

قلعہ ھنڈ ضلع مردان کی تحصیل صوابی کے قریب دریائے سندھ کی قدیم گزرگاہ کے مقام پر واقع ہے۔ جس کا کچھ نہ کچھ تعلق سکندر اعظم، چنگیز خان، شہاب الدین غوری، امیر تیمور، بابر، اکبر، اورنگ زیب، رنجیت سنگھ اور سید احمد شہید سے رہا ہے۔ ھنڈ کو قدیم زمانے میں بھند ادب پور کہا جاتا تھا جو سنسکرت کے لفظ اوک بھند اور پور یعنی پانی سے لیا گیا ہے۔ البیرونی نے 1030ء میں اسے وبھند کے نام سے موسوم کیا ہے۔ نویں صدی میں ہندو شاہی دور میں اس دور کے مسلم سیاح المقدسی نے اس قلعہ کا احوال یوں بیان کیا ہے:

یہ عظیم الشان دارالخلافہ منصورہ سے بڑا تھا جہاں باغات کثرت سے تھے اور دریا پانی سے لبریز تھا۔ یہاں بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں یہاں سردائی اور گرمائی پھل دستیاب ہیں۔ یہاں اخروٹ، امرود اور کیلے کے باغات ہیں جن کی قیمتیں کم ہیں۔ روٹی اور دودھ سستے داموں دستیاب ہیں۔ لوگ صحت مند ہیں مگر موسم قدرے گرم مرطوب ہے۔[143]

قلعہ ھنڈ کے آثار ہندو شاھیہ اور مغل دور سے متعلق ہیں۔ دریا کے مغربی کنارے یہ واقع بیرونی چار دیواری ھندو شاہی دور سے متعلق ہے جبکہ دو برج اسی دیوار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ خستہ حال ٹیلہ ہے۔ جسے سلام گردوھ کہا جاتا ہے۔ جو بظاھر ھندو شاہی دور کا کوئی مندر معلوم پڑتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق 1586ء میں شہنشاہ اکبر نے یہ قلعہ تعمیر کیا جس میں یہ لوگ آباد کئے گئے۔ یہ قلعہ مستطیل شکل میں ہے جس کی ہر بیرونی دیوار کے وسط میں داخلی دروازہ ہے ان دیواروں میں 36 برج تعمیر کئے گئے جبکہ قلعہ میں آباد لوگوں کے لئے داخلی دروازہ شمالی جانب تھا جہاں سے ایک سیدھی سڑک قلعہ کے اندر کی طرف جاتی تھی جو جنوبی دروازے کے قریب جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اکبر نے قلعہ اٹک تعمیر کیا تو ھنڈ کی اہمیت کم ہو گئی۔ خیبر پختون خواہ حکومت نے یہاں سکندر کی یادگار بھی قائم کی ہے۔

قلعہ جمرود

راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکھوں نے عظیم فتوحات کیں شروع میں ان کی حکومت صرف پنجاب تک محدود تھی جبکہ موجودہ خیبر پختوانخواہ کے شمال مغرب میں رنجیت سنگھ نے مقامی قبائلی سرداروں پر 1818ء میں قابو پایا اس نے اس علاقہ کو قریب قریب فتح کر لیا اور ان علاقوں کو اپنی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لئے سکھوں نے مضبوط قلعوں کی تعمیر شروع کی۔ ان قلعوں میں جہانگیرہ فورٹ، تربیلا فورٹ، بالا حصار، ہری پور، مانسہرہ فورٹ قابل ذکر ہیں۔[144]

قلعہ جمرود پشاور سے دس میل شمال مغرب کی طرف جمرود گاؤں میں واقع ہے پشاور سے کابل جانے والی سڑک اور پشاور سے لنڈی کوتل جانے والے ریلوے لائن جمرود سے ہو کر گزرتی ہیں۔ درہ خیبر یہیں ہے جو لنڈی کوتل کو ملاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ لیں کہ لنڈی کوتل درہ خیبر کا مشرقی دروازہ ہے۔ یہ قلعہ ہری سنگھ نلوا نے 1893 بکرمی سمت (1836ء) میں فتح گڑھ کے نام سے بنوایا۔[145]

یہ قلعہ ایک اونچے ٹیلہ پر بنایا گیا مگر آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پہلے بھی کچھ تعمیر تھی۔ ولیم مور کرافٹ جو یہاں اس قلعہ کی تعمیر سے قبل آیا لکھتا ہے کہ خیبر کی پہاڑی سلسلہ کے آخر پر جہاں یہ سطح ختم ہوتی ہے۔ یہ عمومی طور پر اہم جگہ ہے یہاں پتھروں کی ٹوٹی ہوئی دیواریں بکھری پڑی ہیں۔ اور تالاب جن میں ایک کا سائز 60 گز ہے۔[146]

یہ قلعہ ناقص پتھروں سے تعمیر شدہ ہے اس کی دیوار کی بیرونی سطح چکنی مٹی سے ڈھکی ہوئی ہے جو زردی مائل ہے یہ عمارت تین حصوں میں منقسم ہے ان میں نشیبی قلعہ اور بالائی قلعہ اور سطحی قلعہ ہیں۔ جبکہ نشیبی قلعہ میں چوکور بالکونی ہے۔ جس کے ہر کونے میں گول برج موجود ہیں اور افواج کے بیٹھنے کے لئے مورچے اور کمرے تعمیر کئے گئے۔ بالائی قلعے میں ہشت پہلو بالکونی ہے۔ اس کا داخلی دروازہ موٹے لوہے سے بنائے مورچوں سے اندرونی کھڑکیوں کی طرف جانے والا راستہ آہستہ آہستہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ 30 اپریل 1837ء کو افغان افواج کے ساتھ لڑائی کے دوران ہری سنگھ نلوا مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی سمادھ اور گوردوارہ قلعے میں ہی تعمیر کی۔ [147]

قلعہ کافر کوٹ

ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں کافرکوٹ کے مقام پر دو شہر پناہ سے مرصع عمارتیں ہیں۔ جہاں چوکیاں اور ہندو منادر ہیں اور ہر دو عمارات کو ہم شمالی اور جنوبی کافرکوٹ کہہ سکتے ہیں۔ شمالی کافرکاٹ تک چشمہ بیراج کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے۔ جہاں سے بمشکل دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا فاصلہ 12 کلومیٹر ہے۔ یہ قلعہ سلسلہ ہائے کوہ خشور دریائے سندھ کے اوپر معلق ہے۔ جو دریائے کرم کے اتصال پر واقع ہے جبکہ جنوبی کافر کوٹ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے 56 کلومیٹر ہے جو ایک معروف مسلم صوفی کے مزار کے احاطہ بلوٹ میں چشمہ رائٹ بنک کنال پر واقع ہے۔ یہ دریائے سندھ کے اوپر 350 کلومیٹر ہموار دفاعی سطح مرتفع پر واقع ہے جو بلوٹ سے 3 کلومیٹر کے فاصلہ سے واضح نظر آتا ہے۔ یہاں سے شمالی کافرکوٹ ہر کوئی بآسانی جاسکتا ہے۔ جو شمال کی طرف 40 کلومیٹر دوری پر ہے۔ یہ دونوں قلعے پتھروں سے تراشیدہ ہیں۔ جن کی دیواروں میں برج بنائے گئے ہیں۔ شمالی کافرکوٹ کا قلعہ پیمائش میں مشرقی جانب سے مغربی جانب 1000 فٹ جبکہ شمالاً جنوباً 600 فٹ ہے۔ اس کی چار دیواری مختلف وقفوں کے بعد ایک مستطیل مینار سے مزید مضبوط کی گئی ہے۔

مغربی حد پر چوکی بنی ہوئی ہے جو 140 گز پر محیط ہے جہاں سے دور دراز تک نظر جاتی ہے۔ دیواریں نیچے کی طرف سے موٹی اور اوپر سے پتلی ہو جاتی ہیں۔ کچھ میناروں کی بیرونی سطح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ جس سے اس کی اندرونی سطح نمایاں ہوگئی ہے۔ جس سے واضح پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت دو مختلف ادوار میں بنائی گئی۔ بیرونی چار دیواری کا اندرونی علاقہ قدیم بناوٹ کا نمونہ ہے۔ مندروں کے علاوہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جسے ماڑی کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ کے جنوب مشرقی کونے میں 40 x 40 کے سائز میں ہے۔ دونوں منزلوں میں کھڑکیاں ہیں اور درمیان تنگ راستہ ہے جن پر کوئی تزئین و آرائش نہیں ہے۔ اس عمارت میں چند مسلم قبور ہیں جنہیں صحابہ کرام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جبکہ جنوبی کافر کوٹ شمالی کافر کوٹ سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہ حصہ پتھروں کی تعمیر ہے۔ اوپر کی طرف سامنے سے 22 گول مینار ہیں جن کے دو دروازے انتہائی تنگ تھے جو اندرونی اطراف سے ملبہ سے بند ہیں۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں بیرونی چہار دیواری سے کیوں مرصع ہیں اگر ہم علاقہ کی جغرافیائی صورتحال کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ دریائے سندھ کے قرب میں ہونے کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں سے رکاوٹ ضروری تھی سٹین کے نقطۂ نگاہ سے کافر کوٹ بنوں کے علاقہ میں دفاعی اور تجارتی نقطہ نگاہ سے انتہائی اہم رہا ہے۔[148]

دوسری اس کی ممکن ترین وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ 7ویں صدی میں جو بنوں الاہوار پر قابض تھے۔ وہ اس طرح کی چار دیواری بناتے۔ بلاذری کے مطابق مہلب ابن ابی صفرہ امیر معاویہ کے جرنیل نے اس جگہ کو 44ھ/664ء میں فتح کیا۔[149]

شمالی مغربی افغانستان میں اسلامی افواج کی مزید پیش قدمی 9ویں صدی عیسوی تک جاری رہی مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے بنوں اور کوہاٹ کے علاقوں میں ایسی قلعہ بندیاں بنائی گئیں۔

بلوچستان میں قلعے

خاران کے قلعے

خاران کا قدیم نام کاران یا قران ہے۔ الاصطخری نے قران یا برقن پہاڑوں کا ذکر کیا ہے۔ جنہیں اس کے نام سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔[150] البیضادی لکھتا ہے نکودریوں کی شکست میراں شاہ بن امیر تیمور خاران کی وادی میں ہوئی۔

آج خاران بلوچستان کا ایک ضلع ہے۔ جس کی تاریخ گم گشتہ ہے یہاں کے رہنے والے ہلمند اور سیستان سے یہاں آئے غزنویوں اور سلجوقوں کے قدم بھی اس وادی سے گزرے۔ 14ویں صدی میں خاران تاریخ میں واضح ہوا جب میران شاہ نے نکودرین کو شکست دی۔ 17ویں صدی عیسوی میں ہرات میں تیموریوں کی شکست تک خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔

آزادخان نے خاران میں متعدد قلعے بنوائے ان میں جلادر فورٹ، نوروز فورٹ، خاران فورٹ قابل ذکر ہیں۔ آزادخان 1885ء میں فوت ہوا۔

جلادرفورٹ

خاران سے جنوب مغرب کی طرف 50 میل کے فاصلہ پر درہ جلادر واقع ہے۔ اس درہ کے منہ پر ایک چھوٹا سے قلعہ ہے جو پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ چار دیواری جو 270 فٹ پر محیط ہے۔ اس کے دونوں سرے پہاڑوں کے قدموں پر آن ملتے ہیں اور جس کے مغرب میں ایک کشادہ جگہ ہے۔ مورچوں اور چٹان کے درمیان واقع ہے۔[151] اور اس کے مغرب میں اونچے پہاڑوں کی موجودگی دفاعی نقطہ نگاہ سے موجود ہے۔ دیوار 17 فٹ اونچی ہے۔ چار دیواری کے ساتھ ایک مسقف عمارت ہے

جو 11 فٹ چوڑی ہے۔ مورچوں تک رسائی محرابی در کے ذریعے جنوبی جانب سے دی گئی ہے۔

یہ چار دیواری 3 گول برجوں سے مضبوط کی گئی ہے۔ پہلا برج درمیان میں واقع ہے جبکہ دوسرا شمالی دیوار میں اور تیسرا برج داخلی راستہ کے ساتھ ہے۔[152] آزاد خان جب کسی مشکل میں ہوتا تو اپنے خاندان کو اور خزانے کو یہاں رکھتا۔

قلعہ نوروز

ضلع خاران کے شمال مشرق میں واقع یہ قلعہ آزاد خان نے اپنے بڑے بیٹے کے لئے تعمیر کرایا یہ قلعہ باڈو دریا کے ڈیلٹا میں واقع ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹا ہے مگر یہ مضبوطی سے بنایا گیا ہے اور اسے گرمائی رہائش کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ یہ قلعہ پکی اینٹوں سے گارے کی چنائی کے ساتھ بنایا گیا اس کی چار دیواری 30 فٹ تک بلند ہے اور موٹائی 15 فٹ تک اور جنوبی سمت داخلی دروازہ ہے۔ مشرقی مغربی جانب کی دیوار 80 فٹ لمبی جبکہ شمالاً جنوباً 92 فٹ لمبی دیوار ہے۔[153]

قلعہ خاران

یہ ایک مضبوط قلعہ ہے جو پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے اور مربع شکل میں ہے یہاں سے بیٹھ کر میلوں حکمرانی کی جاتی اور مغربی جانب سے یہ قدرتی طور پر پہاڑوں کی وجہ سے محفوظ ہے۔ اس کی چار دیواری 250 فٹ لمبی شمالی اور جنوبی سمت سے ہے۔ جبکہ اس کی چوڑائی 140 فٹ اور اونچائی 35 فٹ تک ہے اور دیواروں کی موٹائی 15 فٹ تک ہے۔ اس چار دیواری میں ہر کونے پر ایک ایک برج ہے۔

میر چاکر خان رند، جسے مورخین چاکر اعظم کہتے ہیں، وہ عظیم تاریخی شخصیت ہے جسے عسکریت، حاکمیت اور حمیت وحیا کا بے مثال نمونہ قرار دیا گیا۔ جو آج تک بلوچوں کی لوک کہانیوں، شاعری اور ثقافتی ورثے کا پرکشش مرکزی کردار چلا آرہا ہے۔ یہ وہ پہلا شخص تھا، جس نے بلوچوں کو شہرت عطا کی، خوشحال مستقبل کی راہ سجھائی۔

پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں مکران کے خطہء کولواہ کا علاقہ، معزز رند بلوچوں کا مرکز اور وادی کیچ ان کا مرجع تھا۔ یہاں کے میر شبیک رند نے کئی شادیاں کیں، مگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ آخر کار 1452ء میں تقریباً پچاس برس کی عمر میں پڑ رندوں کے ایک معزز خاندان کی خاتون ''خان زادی'' کو اپنے عقد میں لیا، اس سے میر شبیک کے ہاں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئی، ان میں سے مائی بانڑی اور میر چاکر رند نے خوب شہرت پائی۔ 1454ء میں کولواہ آشال، مکران میں میر شبیک رند کے ہاں ایک اور فرزند کی ولادت ہوئی۔ میر شبیک رند نے رندوں کے امیر گل محمد کی دختر نیک اختر سے میر چاکر خان رند کی شادی کروادی۔ اس خاتون کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے، جن کے نام میر شہداد، میر اللہ داد خان اور میر شبیک تھے۔ 1474ء میں اپنی زندگی ہی میں 80 سالہ ضعیف میر شبیک نے اپنے امیروں کے مشورے سے اقتدار کی پگڑی، میر چاکر خان کے سر پر رکھ دی اور میر چاکر خان نے اپنے رفقاء کے مشورے سے مکران سے آگے بڑھنے کا دانش مندانہ فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے بلوچوں کی عظمت وشہرت کے مکران، بلوچستان اور ایرانی، بلوچستان سے نکال کر سطح مرتفع قلات، کچھی، سیوی تک اور سیوی سے ملتان، پنجاب اور سلطنتِ دہلی تک پہنچا دیا۔

چاکرِ اعظم نے چالیس سال تک قلات، کچھی، سی اور ڈھاڈر کے وسیع وعریض علاقے میں نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکمرانی کی۔ اپنی عزت وخودداری اور قبائلی روایات کی خاطر اپنے مدمقابل میر گوہرام خان لاشاری سے تیس سال تک برسرِ پیکار رہا، جسے بلوچ تاریخ اور مجالس میں رندہ لاشار کی تیس سالہ جنگ سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی وجہ بظاہر معمولی تھی، لیکن میر چاکر خان نے اپنی ایک باہوٹ (پناہ میں رہنے والی) گوہر نامی خاتون کے اونٹوں کو لاشاریوں کی طرف سے نقصان پہنچانے کو اپنی توہین اور بے عزتی سے تعبیر کرتے ہوئے، اس حرکت کو اپنے اوپر حملہ تصور کیا، جس کے نتیجے میں قبائلی جنگ کا سلسلہ تیس سال تک جاری رہا۔ قبائلی خانہ جنگی نے استحکام اور یک جہتی کو شکست وریخت سے دوچار کیا۔ نا اتفاقی حسد اور ضد کے سائے ہر طرف

پھیلتے گے۔ کچھی، سیوی کی سرزمین بھدی اور ویران ہوگئی، جس کی وجہ سے 1512ء میں میر چاکر خان رند پنجاب کا داخل ہیں۔ سیوی کے مشرق میں ایک ندی اور پہاڑوں میں واقع خوفناک درے کے جو بعد ازاں ''چاکر تھنک'' یعنی چاکر درہ کے نام سے موسوم ہوا، راستے سے پنجاب میں داخل ہوا۔ سیوی کی تباہی و بربادی نے میر چاکر خان رند کو رنجیدہ کردیا تھا، جس کا نوحہ میر چاکر خان رند نے یوں کیا ہے، اس کا مختصر ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے ''سیوی تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑنے والی گرد میں ڈوبا رہا، سات سو سجیلے رند جوان، جو اک خاص ادا سے پگڑیاں باندھتے تھے، جو ایسے مشاق سوار تھے کہ بغیر لگام تھامے گھوڑے دوڑاتے تھے، ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، سب کو تیز دھار والی ہندی تلواروں نے کاٹ کھایا، یہ سب کچھ منحوس گوہر کی وجہ سے ہوا، سیوی کا آخری نظارہ کرنے کے لئے وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور اسے الوداع کہتے ہوئے گویا ہوا، الوداع اے سیوی الوداع!! تمہاری تین چیزیں مجھے خصوصیت کے ساتھ زیادہ مرغوب اور پسند تھیں، جو کبھی نہیں بھولیں گی۔ تمہارے شہد جیسے میٹھے خربوزے، موٹی چکی والی بھیڑیں اور چٹانوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بہتے میٹھے شفاف چشمے!!۔

کوہستان، مری میں چند روز قیام کرنے کے بعد سردارِ اعظم نے کوچ کی تیاریاں کیں، میر بجار جس مقام پر میر چاکر سے علیحٰدہ ہوگئے۔ وتاں میر چاکر خان رند ملتان کے لنگاہ فرمان روا کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ 962ء ہجری بمطابق 1555ء میں ہمایوں نے دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کیا۔ شیر شاہ سوری نے 1539ء میں ہمایوں کو شکست دی تھی، جب ہمایوں شکست کھا کر علاقے میں چھپتا پھر رہا تھا، اور اوکاڑہ کے قریب اس کا ذخیرہ خوراک ختم ہوگیا، تو اس نے میر چاکر کے پاس جا کے امیر بخشو بلوچ سے مدد طلب کی۔ ہمایوں کی بہن نے ''ہمایوں نامہ'' میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بخشو بلوچ نے 100 کشتیاں گندم کی ہمایوں کے لئے دیں'' میر چاکر رند نے شکست خوردہ ہمایوں کی مدد کرکے دوبارہ دہلی کے تخت پر بٹھانے

میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ''لانگ ورتھ ڈیمز'' بلوچوں کی مقبول عام کتاب میں لکھا ہے کہ ''بھوری گھوڑیوں کے شہسواروں کی، بندوقوں کی فائرنگ سے جنگ کا آغاز ہوا، ساعت بھر میں پانی، خون میں تبدیل ہونے لگا، بائیں جانب کی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں، شیخی بگھارنے والے میر عالی بھاگ کھڑے ہوئے اور میر چاکر کو تنہا چھوڑ دیا۔ دہلی کے بہادر ترک میدان کارزار پر چھا گئے۔ ادھر مائی باتڑی میدان کارزار ڈٹ گئی، یہ دیکھ کر بہادر رندوں نے یلغار کر کے ہلہ بول دیا، دہلی کے غضب ناک ترکوں نے پیٹھ دکھائی، اصیل گھوڑیوں کے سوار رند، تلوار کے جوہر دکھا کر سرفراز ہوئے۔'' دہلی کی فتح کے بعد ہزاروں بلوچ خاندانوں نے دارالسلطنت کے مضافات میں مستقل سکونت اختیار کر لی، بعد میں، ان میں سے کئی ایک آگرہ منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے ایک بستی بسائی، جو آج بھی بلوچ پورہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایک جنگی نظم میں بیان کیا گیا ہے کہ ''دہلی کی جنگ میں رندوں کے تین سو جوان کام آئے اور دشمنوں کے ہزاروں افراد۔ اس فتح کے بعد ہزاروں خزانوں والے شہر دہلی پر قبضہ کر لیا گیا اور میر کار نے آٹھ پہر آرام کیا، تاکہ فوجیں آرام کر سکیں، گھوڑیاں تازہ دم ہوں اور ان کے جسموں سے زخم اور سوجن دور ہو'' مشہور مورخ و محقق، نظام الملک نے چار جلدوں میں اپنی معروف کتاب ''منتخب اللباب'' لکھی ہے، اس میں بابر بادشاہ 1526ء سے اورنگ زیب عالمگیر 1658ء تا 1707ء تک کے حالات کا تذکرہ ہے۔ دورِ عالم گیری جلد سوم میں مصنف لکھتا ہے کہ کس طرح بلوچوں نے شکست خوردہ پناہ کے متلاشی داراشکوہ کی اعانت اور مدد کی۔ ملک عبدالباقی لکھتے ہیں کہ ''جس زمانے میں ملتان دارالوبال بنا ہوا تھا، شاہ حسین ارغون نے اہل ملتان کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، ست گھرہ ایسا شہر تھا، جسے دارالامان سمجھ کر یہاں علماء اور مشائخ چلے آتے تھے۔ ستگھرہ میر چاکر خان کی جاگیر تھی۔ ست گھرہ کے گردو پیش میں باغات تھے، جو بلوچ روسا کی ملکیت تھے۔'' جب پنجاب سے سلطان بہلول لودھی اپنے لڑکوں باربک شاہ اور تاتار خان لودھی کے

ساتھ ملتان پر حملہ آور ہوئے، سلطان حسین نے ملک سہراب خان دودائی کی آمد کو نیک شگون سمجھا، اس نے قلعہ سیت پور اور دھن کوٹ کا تمام علاقہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو بطور جاگیر بخش دیا۔ دوسری طرف بہت سے بلوچ یہاں آنے لگے، روز بہ روز ان کی تعداد بڑھنے لگی، یہ دیکھ کر سلطان حسین نے ایک وسیع علاقہ انہیں دے دیا۔ رفتہ رفتہ سیت پور اور دھن کوٹ کے درمیان کا تمام علاقہ بلوچوں کے تصرف میں آ گیا۔ اسی زمانے میں میر چاکر رند اور اس کا لڑکا میر شہداد سیوی سے ملتان آئے، سبی کے مشہور میلے کا آغاز چاکرِ اعظم نے کیا تھا، اس موقع پر بلوچی جرگہ ہوتا تھا، جس میں قبائلی فیصلے کیے جاتے تھے۔ سبی میلہ چار سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی پوری آب و تاب سے منایا جاتا ہے۔ میر چاکر نے سبی کا مشہور وسیع و عریض قلعہ تعمیر کرایا، جو اب تک مگر خستہ حالی میں موجود ہے۔ میر چاکر خان رند کے دور میں بلوچی بزمیہ اور رزمیہ شاعری کو بہت فروغ ملا'' حانی وشہ مرید'' اور'' برگ وگراناز'' کا شہرہ آفاق معاشقہ بھی چاکر خان کے دور میں ہوا، جو بلوچی ادب، تاریخ اور ثقافت کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ بلوچ قبائل ہند، سندھ کے علاوہ افغانستان، ایران اور عرب ریاستوں میں بہ کثرت موجود ہیں۔ بلوچوں میں یہ وصف رہا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی آباد ہوئے، وہاں کی دھرتی سے پیار کیا، اس کے وفادار ہوئے اور وہاں کی ثقافت و زبان کی دھرتی سے پیار کیا۔ چاکر اعظم نے اپنی باقی زندگی اوکاڑہ کے نواح میں گزاری، اطراف میں 18 بیٹوں میں سے بچ جانے والے 7 بیٹوں کو آباد کیا۔ ست گھرہ کے نواحی موضعات آج تک اس کے بیٹوں کے نام سے منسوب ہیں، مرکزی مقام ست گھرہ کہلایا۔ میر چاکر خان نے یہیں وفات پائی اور ست گھرہ ہی میں مدفون ہوا۔ اس کی قبر پر مغل طرزِ تعمیر کے مطابق شان اور مقبرہ تعمیر کیا گیا، جسے سکھوں نے مال دولت کی تلاش میں بے دردی کے ساتھ منہدم کر دیا۔ ''پنجاب کی قدیم داستانیں'' میں، سی آر ٹمپل میر چاکر خان رند کے مقبرے کا حجم محل وقوع اس طرح بیان کرتا ہے'' چاکر خان کا مقبرہ ملتان

ڈویژن کے سروے نمبر 1854-1856 پر محیط ہے، لاہور اور ملتان کے درمیان شاہراہ پر ''سید والا'' کے بالمقابل دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے اور تکیہ نواب چاکر کے نام سے موسوم ہے۔''

مشرقی دیوار میں محرابی در جنوب مشرقی سمت میں بنایا گیا ہے۔قلعہ کے مورچے مسقف ہیں جو سائز میں مختلف پہلی اور دوسری منزل ہیں۔قلعہ کے اندر ایک مسجد بھی ہے جس پر آرائشی نقش ونگار اور ھندسی اشکال بنائے گئے ہیں۔

قلعہ سبی

سبیلو چستان کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ قصبہ ایک قبیلے کے نام پر ہے جو قدیم زمانہ سے یہاں مقیم تھا جبکہ بعض مورخین کی رائے کے مطابق سبی سیوی کی بگڑی کی شکل ہے جو ایک دریا کا نام ہے یا درے کا نام ہے۔عہد وسطیٰ میں درہ بولان تک رسائی اسی علاقہ سے تھی۔ اس قلعہ کو میر چاکر کا قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔جس نے اس علاقہ پر 1450-1540ء تک حکومت کی۔ تاریخی نقطہ نظر سے اس قلعہ کو شاہ بیگ ارغون نے 1511ء میں فتح کیا اور اس کے بیٹے شاہ حسن ارغون نے 1526ء میں اسے مرمت کرایا۔[154] سندھ پر ارغونون کی حکومت سے قبل سبی قلعہ سمہ حکمرانوں کے زیر تصرف رہا۔جب شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہمایوں شکست کھا کر ایران جانے سے قبل اس قلعہ کے پاس مقیم ہوا۔[155]

یہ قلعہ سبی کے قرب میں واقع ہے جو مخدوش حالت میں ہے۔ اس قلعہ کا کچھ حصہ گر چکا ہے قلعہ کی عمارت 400 مربع گز ٹیلے پر تعمیر ہونے کی وجہ سے اس کی چار دیواری رکھی تک 10 سے 15 فٹ اونچی موجود ہے۔جس کی موٹائی تقریباً 8 فٹ ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر چوکیاں ہیں۔ دروازوں والی بالکونی ہے۔ یہ عمارت غالباً امراء شاہ کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتی۔ سپاہیوں کے لئے بیرکیں تعمیر کی گئیں جو اب کھنڈرات کی شکل میں ہیں۔مغربی کی جانب سے داخلی دروازہ تھا جو اب ختم ہو چکا

ہے۔ قلعے کے جنوب مغرب سمت میں دومٹی کی اینٹوں سے بنی ہوئی گنبدنما عمارتیں ہیں۔ ہر کسی کی بلندی 25 فٹ ہے۔ جو تنگ سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی ہیں جو اندر سے کھوکھلی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جگہ غلہ ذخیرہ کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہو۔ آج کل یہ قلعہ پاکستانی فوج کے تصرف میں ہے۔جنہوں نے اپنی مرضی سے اس میں کئی اضافے اور تبدیلیاں کرلی ہیں[156]۔

گلگت بلتستان کے قلعے

بلتتی فورٹ

بلتتی فورٹ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں وادی ہنزہ کے علاقائی حدود میں واقعہ ہے۔ ہنزہ دنیا کی مشہورترین تین پہاڑی سلسلوں قراقرم، ہمالیہ، اور ھندوکش کے سنگم میں واقع ہے۔ وسطی ہنزہ کا حُسن مجموعہ ہے۔ قراقرم ہائی وے سے گلگت کی جانب سے آتے ہوئے علی آباد سے گزرتے ہیں۔ علی آباد پہاڑی پر دو دیہات التت اور بلتت واقع ہیں۔ پورے گاؤں میں سب سے اونچی جگہ پر یہ عظیم الشان قلعہ واقع ہے۔ گلشیر سے گھرا ہے اور دنیا کی بلندترین چوٹیوں پر واقع ہے۔ یہ فن تعمیر کی انوکھی مثال ہے قلعہ کی تعمیر کی بابت ابھی تک شکوک وشبہات موجود ہیں۔ ایک مقامی باشندے کے مطابق قلعہ کوئی 700 سال قبل تعمیر ہوا۔ حالیہ سائنسی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ 765 سال پرانا ہے جو امراء کی ملکیت بن گیا۔ جب بلتستان کی شہزادی شاہ خاتون نے 15ویں صدی کے ابتداء میں مکنزہ کے ایک مقامی شہزادے سے شادی کی جس کا نام آئشو II تھا۔ شہزادی اپنے ہمراہ 300 ہنرمند لائی جیسے ترکھان، مستری، اور ماہر مزدور۔ انہوں نے پہلے التت فورٹ کو مرمت کیا اور اس کے بعد بلتت فورٹ کو بھی مرمت کیا۔157

قدیم دور میں بلتستان بلتی ریاست کا حصہ تھا اور اس وقت بلتستان چھوٹے بلتت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ تبتی فن تعمیر کی جھلک بلتتی قلعے کی تعمیر میں نظر آتی ہے۔ تعمیر بتاتی ہے کہ پہلے یہ عمارت مختصر تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی لکڑی کی یہ مضبوط تعمیر قابل دید ہے۔ اس میں ڈائنگ ہال، مہمانوں کے لئے کمرے، جانوروں کے رکھنے کی

جگہ اور غلہ ذخیرہ کرنے کے لئے بھی جگہ موجود ہے۔ پکانے کھانے کے لئے کمرے کے درمیان میں آگ کے لئے جگہ بنائی گئی ہے آگ کے دھوئیں کے اخراج اور سورج کی روشنی کے حصول کے لئے راستہ رکھا گیا ہے۔ عمارت کا سائز 1000 میٹر ہے۔ جو سجاوٹی عناصر اور بناوٹ کے لحاظ سے دوسری عمارتوں سے منفرد ہے۔ مغربی ماتھا دو اور تین منزلہ بلند ہے جبکہ مشرقی طرف سے ماتھا ایک منزلہ ہے۔ جنوب مغربی کونے پر مینار ہے جو ۴ منزلہ بلند ہے۔ اس عمارت میں 35 اندرونی کمرے ہیں جو برآمدوں سے ملحق ہیں۔ قلعے کی باقی عمارتوں میں تخت، دیوان عام اور صحن شامل ہیں۔ جو لکڑی کے کام کا عمدہ نمونہ ہے۔ بیسویں صدی میں اسے ایک جدید عمارت میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1891ء میں برطانوی فتح کے وقت میر صفدر خان ہنزہ کا حکمران تھا۔ مگر وہ کاشغر فرار ہو گیا۔ اس کی جگہ 1892ء میں محمد نظیم خان کو میر آف ہنزہ کے طور پر بٹھا دیا۔ 1945ء تک یہ قلعہ رہائشی محل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ جب آخری حکمران میر محمد جمال خان جب ایک نئے محل میں چلا گیا تو 1975ء اس کے مرنے کے بعد اس قلعہ کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ خستہ حال کا شکار ہو گیا۔ 1985ء میں غضنفر علی خان میر آف ہنزہ نے پرنس کریم آغا خان کو درخواست کی کہ قلعہ کو محفوظ کیا جائے۔ جس پر فوری عمل ہوا۔ اب یہ قلعہ بلتت ہیری ٹیج ٹرسٹ کو عطیہ دے دیا گیا۔ اسکی بحالی کا کام 1991ء میں شروع کیا گیا جو 1996ء میں مکمل ہوا 2,00,000 ڈالر صرف ہوئے اس قلعہ نما میوزیم اور ثقافتی مرکز قائم کیا گیا ہے۔

التت فورٹ

بلتائی شہزادی شاہ خاتون جس نے ہنزہ کے شہزادے عیشو II سے شادی کی اپنے ساتھ ہنر مندلائی اور ان کو تنخواہ پر رکھا بلتت قلعہ کے ساتھ ساتھ التت فورٹ کی تعمیر بھی انہی کاریگروں نے کی۔ اس کی تاریخ سن کہ چوکور مینار پر درج ہے۔ 919ء/1513ء یا 989ء/1581 ء یہ عربی رسم الخط میں لکھی [158]۔ یہ قلعہ دریائے ہنزہ پر جنوب کی

جانب افقی چٹان کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے۔ جس میں پتھر اور کنکریاں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ پتھر پتوں کی شکل میں گارے سے جمائے گئے ہیں۔ اور لکڑی کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ پتھروں کو یکجا اور صحیح زاویے پر جمانے کے لئے لکڑی استعمال کی گئی ہے۔ جبکہ دیوار کا بیرونی حصے کو ویسے ہی رہنے دیا گیا ہے جبکہ اندرونی حصہ کو پلستر کیا گیا ہے۔ قلعہ 3 منزلہ ہے۔ زمینی منزل پر گارڈ روم، اور ھنزہ کا پانی ذخیرہ کرنے کے لئے جگہ بنائی گئی ہے۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے ہیں جبکہ تیسری منزل پر کھلی چھت ہے۔ جس کے درمیان سکیورٹی کے لئے ایک مینار بنایا گیا ہے۔ اس کے جنوب میں ایک اور کمرہ ہے مغرب میں گارڈ کے لئے ایک ہال بنا ہے شمال جانب ایک چھوٹی مسجد ہے جو بی بی فورٹ یا گوہر کے نام سے موسوم ہے۔[159] مسجد میں ایک چوکور جائے نماز ہے اور مشرقی جانب برآمدہ ہے جس کے دو اطراف محرابی در ہیں۔

کھر یوچہ قلعہ سکردو

یہ قلعہ دریائے سندھ کی سطح سے 1880ء فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی قدرتی بناوٹ ایسی ہے کہ اس کی پیمائش ناممکن ہے۔ اتنی بلندی پر ایسا قلعہ تعمیر کرنا بلتی ھنر مندوں کی کاریگری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 20 یا 30 فٹ سائز کے بڑے شہتیر اور لکڑی کو اس کی مطلوبہ جگہ پر لگانا اور بجائے خود ایک مشکل کام ہے۔ یہ قلعہ مستطیل ہے جس کا رقبہ 2 مربع کلومیٹر ہے۔

پتھر اور بجری کے موٹے ٹکڑوں سے گارے سے جمائے گئے ہیں۔ جن کو لکڑیوں کی مدد سے سیدھا رکھا گیا ہے اور چھت کے ساتھ پردے بنائے گئے ہیں۔ داخلی دروازہ جنوب کی جانب ہے جس کے لکڑی کے دو کواڑ ہیں۔ قلعے کی سب سے بلند جگہ پانی کا ٹینک ہے جو محمد مراد یا شاہ مراد نے تعمیر کروایا۔ جنوبی داخلی راستے کے نزدیک مسجد واقع ہے۔ اس جگہ ایک اور قلعہ ہے۔ مینڈ ذک جو کھر یوچہ قلعہ کے بالکل نیچے واقع ہے۔ یہ قلعہ حشمت اللہ خان کے مطابق علی شیر خان انچن کی لداخی ملکہ مینڈ ذک گیلامو نے تعمیر

کرایا۔ جوفن تعمیر کے لحاظ سے کھریوچہ قلعہ سے مختلف ہے۔ اس میں مغل فن تعمیر کی خصوصیات ملتی ہیں یہ بلکہ مغلوں کے فن تعمیر سے آشنا تھی جو باغات اور پانی کے فواروں کی تعمیر کا فن جانتی تھی۔[160] اس قلعہ میں یہ آثار اب بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر حسین خان نے مقامی بلتی کے حوالے سے لکھا ہے:

علی شیر خان انچن نے اکبری دور میں مغل دربار میں پناہ لی تھی۔ اس نے بعد میں ایک مغل شہزادی گل خاتون سے شادی کر لی۔ جسے مقامی زبان میں مینڈ ک ریگا لمو یعنی (پھول شہزادی) کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے ساتھ ہندوستان سے انجینئر، ترکھان، سنگتراش، لوہار اور ہنر مند لائی۔ جس نے بلتستان میں مغل ثقافت وفن کو متعارف کرایا۔[161]

اختتامیہ

زیرِ نظر کتاب سے پہلے میری آثار قدیمہ کے حوالے سے دو کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں پنجاب کے آثار قدیمہ اور سندھ کے آثار قدیمہ شامل ہیں اس سلسلے کی یہ تیسری کاوش ہے۔ اگر چہ ان دو کتب میں چند قلعوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے مگر پاکستان کے قلعوں اور اسکے قلعہ بند شہروں کی تفصیل از بس کہ ضروری تھی اس کتاب کا آغاز باب الاسلام سندھ سے کیا گیا ہے اور صوبہ سندھ کے قلعوں کی تاریخی تفاصیل مہیا کی گئی ہیں سندھ کے بعد پنجاب کے قلعوں کے اور خیبر پختونخواہ کے قلعے اور بلوچستان کے قلعوں کی تاریخی تفاصیل مہیا کی گئی ہیں۔ اسکے علاوہ نئے صوبہ گلگت بلتستان کے قلعے بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ ضخامت کے ڈر سے پوری تصاویر اس میں شامل نہیں کی جاسکیں جس کا ازالہ دوسرے ایڈیشن میں کر دیا جائے گا۔

اس کتاب میں 31 قلعے سندھ میں 34 پنجاب میں اور 5 قلعے خیبر پختونخواہ میں 5 بلوچستان اور 4 شمالی علاقہ جات کے اس طرح کل 79 قلعوں کی مختصر تاریخ دے دی گئی ہے۔ اسکے علاوہ پاکستان میں قلعہ بند شہروں اور پنجاب اور سندھ کے فن تعمیر اور قلعوں کے بارے میں حاصل معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ میری اس کاوش کو بارآور کیا جائے گا۔

☆☆☆

حواشی وتعلیقات

1- سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ص 17

2- ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، قلعے، بروشر، میلہ مویشاں، فورٹریس سٹیڈیم، ص 4

3- ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، علم وعرفان پبلشرز، لاہور 2011ء ص 139۔

4- ایضاً

5- Kenoyer. J. Mark, Ancient Cities of Indus Vally, Civilization, American Institute of Pakistan Studies, Oxford, 1998

6- Ihsan H. Nadiem, Moenjodaro-Heritage of Mankind, Sang-e-Meel, Publication, Lahore 1995, Page-17

7- ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص 101

8- ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، محولہ بالا 2

9- ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، محولہ بالا ص 7

10- Dr. Saif-ur-Rehman Dar, Taxila, and the western world. Al waqar publishers, 1984-p.67

11- ایضاً

12- ایضاً

13- Dr. Saif-ur-Rehman Dar,Taxila,and Hellenism, LHR. 1976-p.13

14- ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار، محولہ بالا ۲

15- Shaikh Khurshid Hasan, Historical Fort in Pakistan, National Institute of Historical and Cultural Research Islamabad 2005, p.54

16- Morti mar wheeler, Five thousands year of Pakistan,Royal India and Pakistan Society London, 1950, Page-72

17- Micheal W. Meister, Temple alongwith, The Indus Expeditional 38 No. 3, 1996, Page-31

18- ڈاکٹر ایف اے خان بھنبھور، محکمہ آثار قدیمہ، کراچی 1986ء ص18

19- Ahmed Nabi Khan, Al-Mansurah, a forgotten Areb Metropolis in Pakistan, Department of Archaeology, Karachi, 1990. Page-156

20- ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص73

21- Ahmed Nabi Khan op.cit p.158

22- Col. M. Rasid, Military Architecture in Pakistan, Pakistan Quarterly, 1955. Page-25

23- I.H. Nadiem, Rothas- Formidable Fort of Sher Shah Suri, Lahore, Sange Meel Publication, P.13.

24- دیکھیے تصویر دروازہ قلعہ کوٹ ڈیجی۔

25- دیکھیے تصویر منجنیق۔

-26 Dr. M.R Mughal, Ancient Cholistan, Feroz Sons, Ltd. Page-103

-27 ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، محولہ بالا۔

-28 عشرت علی خان، حیدر آباد، ادراک، پبلی کیشنز 2002، حیدر آباد، ص 39

-29 James Burns, A Visit of the court of Sindh.

-30 میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، تحفۃ الکرام تصحیح و حواشی، مخدوم امیر پرنسپل اورنٹیل کالج، حیدر آباد، ڈاکٹر نبی بخش، بلوچ، مترجم اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ 1959 ص 324

-31 ڈاکٹر ممتاز پٹھان، سندھ کے تاریخی شہر، نئی زندگی۔

-32 میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، محولہ بالا، ص 147

-33 ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص 59

-34 Elexander Burners. A Visit of the Court of Sindh.

-35 عشرت علی خان، حیدر آباد، محولہ بالا، ص 39

-36 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص 68

-37 ڈاکٹر ایف اے خان، بھنبھور، محکمہ آثار قدیمہ، کراچی 1986 ص 8

-38 ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا ص 21

-39 Abdul Ghufur, Fourteen inscriptoins from Bhanbor,The site of Deybul, Pakistan Archacology, No. 3, 1966, Page 65-90

-40 ایف اے خان، بھنبھور، محولہ بالا، ص 27

-41 Abdul Ghuffur,Fourteen Inscriptoins from

Bhanbore,Op.Cit. P.66

-42 ڈاکٹر ایف اے خان، بھنبھور، محولہ بالا۔

-43 M.H.Pathan,Arab Kingdom of Al-Mansoruah in Sindh, P-65

-44 البلاذری، فتوح البلدان، ص 448، المسعودی، معارج الذھب، ص 142، الاصطخری، الامسالک والمما لک، ص 175، ابنِ حوقل، صورۃ الارض، ص 321، المقدسی، احسان الاتقسیم، فی الاقالیم، 476، بزرگ ابن شہریار، عجائب الہند، ص 78

-45 Gvunebaum, G.E. Von, the Structure of Muslim State in Islam. Essay in the nature and growth of the cultural traditions, London, 1955

-46 ابوالفضل، آئین اکبری، ص 160

-47 Ahmed Nabi Khan, Al Mansurah-A forgotten Arab Metropalis in Pakistan, Department of Archaeology, Karachi, 1990, P-56

-48 ایضاً ص 46 ,44

-49 ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص 73

-50 ایضاً ص 74

-51 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا۔

-52 ایضاً ص 151

-53 بدرابڑو، دیوار سندھ قلعہ رنی کوٹ، 1996۔ کراچی، ص 28

-54 Lt. Col. K.A Rashid, Ranikot Fort, Iqbal Review, Iqbal Academy, Pakistan, Vol. VI No. 1, April 1965, PP.33-50

-55 بدر ابڑو، دیوار سندھ، قلعہ رنی کوٹ، محولہ بالا ص53

-56 Eshan H. Nadiem, Forts in Pakistan, Al Faisal Publishers, Urdu Bazar, Lahore P-25

-57 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ، ص104

-58 Col. K.A Rashid, Rani Kot Fort,Op.Cit.

-59 A.W. Huges, Gazetteer of the Province of Sindh, 1876 P-48

-60 Col. K. A Rashid, Rani Kot Fort, Op. cit.

-61 ایضاً

-62 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا ص120

-63 غلام رسول مہر، تاریخ سندھ (کلہوڑا عہد) حصہ ششم، جلد اول، سندھی ادبی بورڈ، بندر روڈ، کراچی، ص42

-64 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص125

-65 میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، تحفۃ الکرام، محولہ، ص133

-66 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص67

-67 ایضاً ص134

-68 منہاج سراج، تاریخ فیروز شاہی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ص29

-69 Shiekh Khurshed Hasan, Historical Fort of Pakistan, Op. cit, Page-88

-70 میر معصوم بھکری، تاریخ معصومی، 1459ء، ص45

-71 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص140

-72 Sheikh Khursheed Hassan, Histrocial Forts of Pakistan, Op. Celm, Page-88

-73 ایضاً

-74 Ihsan H. Nadiem, Forts in Pakistan op.cit- p.56

-75 غلام رسول مہر، تاریخ سندھ، حصہ اول، ص42-439

-76 غلام رسول مہر، تاریخ سندھ، حصہ دوم، 04-803

-77 این اے بلوچ، 1996، ص287

-78 I. H. Nadiem, Forts in Pakistan, op.cit.49

-79 ایضاً

-80 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص152

-81 I.H Nadiem, Forts in Pakistan, op.cit-P.43

-82 محمد اقبال بھٹہ، سندھ کے آثار قدیمہ، محولہ، ص159

-83 فتوح البلدان ص441، چچ نامہ، ص87-85

M. Mumtaz Hussain Pathan, History of Sindh, Series Vol-III, Sindhi Adbi Board

-84 M.H. Panhwar, Source Material of Sindh, Institute of Sindhology, University of Sindh, 1977, Page-421

-85 Ihsan H. Nadiem, Moenjodoro Heritage of mankind, Sangee Meel Publiications, lahore

1994, Page-15.

-86 Dr. Saif Ur Rehman Dar, Architecture of Punjab Booklet National horse and cattle show, Lahore.

-87 عبداللہ چغتائی،فن تعمیر، ویسٹ پاکستان پبلشنگ کمپنی، اردو بازار، لاہور۔ 1963ء،ص24

-88 ایضاً

-89 محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ،علم وعرفان پبلشرز،اردو بازار،لاہور

-90 ایضاً،ص19

-91 Col. A. K Rashid, Military Arcitecture in Pakistan, Pakistan Quarturly, 1955. Page -25

-92 ایضاً

-93 ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ،محولہ بالا،ص96

-94 ایضاً

-95 ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ،محولہ بالا،ص102

-96 نورالدین محمد جہانگیر،تزک جہانگیری،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،ص38

-97 I.H. Nadiem,Rothas Op.cit-p.47

-98 I.H Nadiem, Forts in Pakistan, Op. cit, P-48

-99 Dr. Saif ur Rehman, Nandana Gate Way to salt range,Karachi, No. 31,1998,PP.44-45

-100 Sheikh Khurshid Hassan,Historical Forts in Pakistan, Op.cit-p.48

101- ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ،ص108
102- مسعودالحسن شہاب، خطہء پاک اوچ شریف،اردو اکیڈمی،ص 97-76
103- Malik Muhammad Din, Gazetter of Bhawalpur State, P-107
104- M. R. Mughal, Ancient Cholistan, Feroz Sons (Pvt.), Ltd. 1998, Page-103
105- Ibid
106- حدودالعالم۔مخطوطہ،994ء
107- نورالدین محمد جہانگیر، تزک جہانگیری،ص162
108- ایضاً،ص211
109- کنہیالال، تاریخ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،1990ء،ص128
110- عبداللہ قریشی، لاہور کے تاریخی مقامات، نقوش لاہور نمبر ادارہ فروغ اردو، 1986ء،ص38۔
111- محمد اقبال بھٹہ، لاہور اور فن خطاطی، علم وعرفان پبلشرز، دسمبر 2007،ص 352
112- ایضاً
113- I. H. Nadiem, Lahore. A Glorious Heritage, Sang-e-meel, Publications, Lahore 1996
114- Nazir Ahmed Chaudhry, A short History of lahore and some its monuements, Sang-e-Meel Publications, 2000. Page-87
115- Muhamma Baqir, Lahore past and present,

Dehli, Low Price Publications, 1993-P-39

-116 محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ، علم وعرفان پبلشرز، لاہور، مئی 2007، ص118

-117 Khurshid Hassan Sheikh, Historical Forts in Pakistan, Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, Page-138.

-118 Ibid.

-119 Ebba Koch, Mughal Architecture prestel-1991-p.22

-120 محمد اقبال بھٹہ، پنجاب کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص128

-121 Mortimer Whealer,Five Thousand Years of Pakistan, Royel India and Pakistan, Society, London, 1950, Page-78

-122 District Gazetter, Attock-p.38

-123 اکبر یوسف زئی، قلعہ اٹک، روزنامہ جنگ، 9جولائی2000۔

-124 ایضاً

-125 Maj. General Mayaddin, Attock Forts, Pakistan, Querterly No. 1, Vol-I, 1952, Page-39

-126 Sh. Kurshid Hassan, Historical Forts in Pakistan, Op. cit, Page-94

-127 محمد اقبال، پنجاب کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص132

128- Sh. Khurshid Hassan, Historical Forts in Pakistan, Op. cit. Page-94

129- ملک دوست محمد، عظیم تھل کا تاریخی شہر منکیرہ، روزنامہ جنگ مڈویک، 24 تا 31دسمبر 2008ء۔

130- علی شاہ، قلعہ منکیرہ ہفت روزہ، فیملی میگزین، 23فروری تا یکم مارچ 2000۔

131- محمد اقبال، پنجاب کے آثار قدیمہ محولہ بالا، ص 139

132- شاہ زیب خان، چولستان کے 22 تاریخی قلعے۔ روزنامہ پاکستان، 30اپریل، 2000

133- محمد اسلم، قلعہ دیپالپور، جنگ مڈویک، میگزین 11 نومبر 2009ء

134- شاہ زیب خان چولستان کے 22 تاریخی قلعے محولہ بالا

135- دیکھئے بہاولپور میوزیم کے داخلی دروازے کے ساتھ رکھے گئے ستون۔

136- Muhammad Sadique, Harraud Fort, Lahore, Museum Bulletin, 1997-98 Nos. 1,2, PP. 55-57

137- Mr. Bruce Gazetter of Dera Ghazi Khan, District Punjab Goverment, 1998- P-18

138- Ibid. Page-19

139- A cunningham Ancient Geograpy of India chueeruerty chattergil and co. calculta.

140- Sh. Khurshid Hassan, Histrocial Forts in Pakistan, Op. Cil, Page-110

141- میجر ریورٹی۔ 1852ء، ص 25

142- الفنسٹن، 1842ء، ص 96,97

143- خورشید احمد فاروقی، 1962،ص 65-264

144- Sh. Khurshid Hassan, Op. cit, Page-113

145- Ibid.

146- ibid.

147- ولی اللہ خان، 1962،ص 56

148- Stein (1905:14)

149- البلاذری 1978ء ص 421

150- Mahammadan History

151- البیضاویؒ، روضہ الصفاء۔ مخطوط لاہور میوزیم

152- District Gazetter kheran, 1986, Page-164

153- Ibid, Page 149

154- ایم ایچ صدیقی 1972 ص 51

155- ابوالفضل, 1939، حصہ اول ص 389

156- حماد اللہ سیاپاد، روزنامہ جنگ، 6 فروری 2011ء،ص 32

157- قدرت اللہ، حصہ اوّل، 1962ء،ص 68

158- احمد حسن دانی، 1989،ص 162-156

158- ایضاً 2007،199

160- حشمت اللہ خان، 1969،ص 510

161- حسین خان، 1964،ص 80-179

☆☆☆

IQBAL PUBLISHERS

اقبال پبلشرز لاہور